وہ جس کے سینہ میں علم انور، وہ جس کے ہونٹوں پہ ذکرِ انور
وہ شیخ انور کا عکسِ انور، وہ شیخ انظر بھی چل دیا ہے

مصنف
نسیم اختر شاہ قیصر
استاذ دار العلوم (وقف) دیوبند

ناشر
ازہر اکیڈمی شاہ منزل محلہ خانقاہ دیوبند ۲۴۷۵۵۴

وہ جس کے سینے میں علمِ انور، وہ جس کے ہونٹوں پہ ذکرِ انور
وہ شیخ انور کا عکسِ انور، وہ شیخ انظر بھی چل دیا ہے

شیخ انظر

مشاہدات • تاثرات

مصنف

نسیم اختر شاہ قیصر

استاذ دار العلوم (وقف) دیوبند

ناشر

۲۴۷۵۵۴

ازہر اکیڈمی شاہ منزل، محلّہ خانقاہ دیوبند

تفصیلات

نام کتاب	:	شیخ انظر (مشاہدات، تاثرات)
مصنف	:	نسیم اختر شاہ قیصر
صفحات	:	۸۰
قیمت	:	
باہتمام	:	عبید انور شاہ قیصر، عزیر انور شاہ قیصر خبیب انور شاہ قیصر
مطبع	:	رمزی آفسیٹ پریس دیوبند
ناشر	:	ازہر اکیڈمی شاہ منزل، محلّہ خانقاہ دیوبند موبائل:09358484586
کمپیوٹر کتابت	:	الفضل کمپیوٹرس دیوبند09412680624#

امام العصر

حضرت علامہ

انور شاہ

کشمیری

رحمہ اللہ

کی

عظیم

علمی خدمات

اور

عبقری شخصیت کے نام

٭٭٭

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سخنِ اول

نسیم اختر شاہ قیصر

حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحبؒ کی زندگی کے مختلف پہلو اور مناظر جو ہم نے دیکھے اور جن سے متاثر ہوئے ان ہی کے اجمالی اور تفصیلی تذکرے کا یہ مجموعہ، شیخ انظر، مشاہدات، تاثرات، ہے یہ سوانحی خاکہ نہیں بلکہ ادھر ادھر بکھرے ہوئے اور مختلف زمانوں میں مرتب ہونے والے وہ نقوش ہیں جن کو میں نے یکجا کر دیا ہے حضرت شاہ صاحبؒ کی حیات میں جو مضمون ''ترجمان دیوبند'' کے صفحات پر شائع ہوا اور پھر میرے مضامین کے مجموعہ ''میرے عہد کے لوگ'' کا حصہ بنا وہ بھی اسی کتاب کا حصہ ہے۔

شاہ صاحب کے وصال کے بعد اس احساس نے شدت اختیار کی اور عام وخاص کو اسی فکر میں مبتلا دیکھا کہ ان کی جدائی نے سب کو مغموم اور رنجیدہ کیا اور ان کی بلند صفات شخصیت سے محرومی ایک بڑے نقصان کی صورت میں سامنے آئی مقبولیت، محبوبیت، مرجعیت کا یہ انداز کم دیکھنے میں آتا ہے اضطراب، بے چینی، تڑپ اور مایوسی کی ایسی کیفیت سے کم دوچار ہوئے ہیں یہ صرف حروف والفاظ کی ترکیب نہیں بلکہ دلوں کو غم واندوہ میں ڈبو دینے والے وہ احساسات ہیں جن کی ترجمانی بھی صحیح طور پر نہیں ہو پا رہی ہے شاہ صاحبؒ کا شمار ان خوش نصیبوں میں ہوتا ہے جو زندہ رہے تو ممتاز بن کر اور رخصت ہوئے تو نرالی شان کے ساتھ، ان کی ۸۲ سالہ زندگی اور زندگی سے دوری کے بعد تجہیز، تکفین اور تدفین کے مراحل میں انسانوں کے بے پناہ ہجوم کی محبت، عقیدت، چاہت، اور سوگواری کا جو ماحول دیکھا وہ اس عظیم انسان کی بارگاہِ الٰہی

میں مغفرت اور بلندیٔ درجات کا ذریعہ بنے گی انشاء اللہ دربارِ الٰہی میں دعاء ہے کہ خداوند عالم شاہ صاحبؒ کی ہر نیکی کو قبول فرمائیں اور ان کے ساتھ خصوصی معاملہ فرما کر رحمتِ کاملہ سے نوازیں (آمین)

برادرم ڈاکٹر عبید اقبال عاصم قاسمی نے بھاگتے دوڑتے چند سطور کتاب کے لئے لکھدی ہیں ان کا شکر گذار ہوں برادرم مولانا عبد المنان صاحب قاسمی مہتمم دار العلوم اصحاب صفہ (رنکتا) آگرہ نے طباعت کے مرحلہ کو آسان بنایا ان کا بھی دینی، انسانی اور اخلاقی بنیادوں پر شکریہ واجب ہے۔

نسیم اختر شاہ قیصر
مہتمم الجامعۃ الانوریہ
شاہ منزل محلّہ خانقاہ دیوبند
۲۳/۶/۱۴۲۹ھ-۲۸/۶/۲۰۰۸ء
بروز شنبہ

چند سطور

ڈاکٹر عبید اقبال عاصم قاسمی

فخر المحدثین حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب کشمیریؒ رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کو اس صدی کے اہم ترین المیوں میں شمار کیا جائے تو یہ بے جا نہیں ہوگا، عالم بے نظیر، ادیب بے مثال، خطیب لاجواب، مفکر دوراں، محدث عصر وغیرہ جیسے خطابات والقاب سے انہیں نوازا گیا جن کے وہ واقعتاً مستحق بھی تھے اور اس کے لائق وفائق تھے۔

شاہ صاحب علیہ الرحمہ کی زندگی کے کم وبیش پچاس سال درس وتدریس میں گذرے، ان کے علوم سے کم از کم تین نسلوں نے اکتساب فیض کیا، تدریس کے ابتدائی دور سے شہرت ان کی دامن گیر رہی، جس میں ہر روز اضافہ ہی ہوا، ان کی موت کے صدمے نے ان کے شاگردوں کو غمزدہ اور رنجیدہ کر دیا، بہت سے شاگردوں نے ان کی حیات کے مختلف گوشوں پر کچھ نہ کچھ لکھ کر اظہار عقیدت وشاگردی کیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے ہی خاندان کے روشن چراغ برادرم مولوی نسیم اختر شاہ قیصر زید مجدہم وبرکاتہم نے اپنے مخصوص انداز سے پیش نظر کتاب ''شیخ انظر'' میں جس انداز سے اپنے تاثرات ومشاہدات کو بیان کیا وہ تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے زمانہ جب بھی شاہ صاحب علیہ الرحمہ کے مطالعہ کی ضرورت محسوس کریگا وہ اس کتاب سے مستفیض ہوئے بغیر نہیں رہ سکے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ حضرت شاہ صاحب کو سمجھنے کی ابتداء ہے، ان پر بہت کچھ لکھنا اور ان کی زندگی کے ہر پہلو کو روشن واجاگر کرنا ان کے خاندان اور ان کے شاگردوں پر ان کا حق ہے، یہ شاہ صاحب علیہ الرحمہ کی خوش قسمتی وسعادت ہے کہ اللہ

تعالیٰ نے انہیں لائق ترین شاگرد بھی دیئے اور خاندان میں اہل قلم افراد بھی جو انشاء
اللہ العزیز مختلف اوقات میں حضرت شاہ صاحب کی زندگی کی مختلف جہات کو عوام
وخواص کے سامنے پیش کر کے ان کی خدمات کو اجاگر کرتے رہیں گے۔

مختصر وقت میں مولانا نسیم اختر صاحب نے جن مشاہدات وتاثرات کو قلم بند
کر کے کتابی شکل میں پیش کیا ہے اس کے لئے وہ بشمول میرے سبھی شاگردانِ شاہ کے
شکریے کے مستحق ہیں، اللہ تعالیٰ شاہ صاحب علیہ الرحمہ کو اعلیٰ علیین میں جگہ مولانا نسیم
اختر شاہ صاحب کی اس کتاب کو مقبول ومشہور اور زمانے کو اس سے مستفیض ہونے کی
توفیق عطا فرمائے، آمین۔

❁ ❁ ❁

شاہ صاحبؒ کی لازوال تحریریں

شاہ صاحب نے تحریر و قلم سے آخر دم تک وابستگی قائم رکھی یہ وابستگی واجبی درجہ کی نہیں بلکہ ان کا قلم ۵۵/ سال سے زائد تک گلکاریاں کرتا رہا تھکن اور ضعف کے آثار کہیں دکھائی نہ دیئے اور نہ کبھی ایسا محسوس ہوا کہ وہ اب اپنے آپ کو زبردستی کھینچ رہے ہوں مضامین کی آمد، زبان کی شوکت اور تحریر کی جاذبیت اسی طرح قائم رہی وہ شگفتہ شاداب اور بولتی تحریریں لکھتے رہے پھر ان کی تحریر کی یہ خوبی تھی کہ ان کے کسی مضمون کا کوئی ٹکڑا اور دوسرے حضرات کی تحریروں کے نمونے بغیر کسی حوالے کے ایک ساتھ رکھدیئے جائیں تو ان کی تحریر خود آگے بڑھکر گواہی دیتی ہے میں انظر شاہ کی تحریر ہوں، میں ان کی تخلیق ہوں ان کا اسلوب ہی اس انداز کا تھا کہ اگر کسی نے چند بار ہی ان کو پڑھا ہے اس کے لئے اس امتحان میں کامیاب ہونا انتہائی آسان عمل تھا یہ عنوان ذرا طویل گفتگو چاہتا ہے اور اس میں ان کی تحریروں کے اختصاص کو ابھارنے کے لئے حوالوں کی بھی ضرورت ہے اور یہ کام ہم ان کی تصنیفات ہی سے لیں گے بے شمار اور لاتعداد مضامین جو اخبارات و جرائد میں شائع ہوئے سر دست ہمارے سامنے نہیں ہیں اپنے والد مرحوم امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی مبسوط سوانح ''نقش دوام'' کے نام سے تصنیف فرمائی تو آغاز کتاب ہی میں کشمیر پر یہ چند سطور ان کے منفرد انداز کا ابتدائی تعارف کہہ لیجئے۔

''حضرت شاہ صاحب مرحوم کا آبائی وطن وہی کشمیر ہے جو اپنے حسن و جمال، رعنائی دکشش، جاذبیت ودلکشی، شبابی وشادابی میں عالمی شہرت رکھتا ہے جسکی پر حسن فضا، دوڑتے ہوئے دریا، اچھلتا ہوا پانی، چشموں کی فراوانی، نکہت گل کی کثرت، پھلوں

کی بہتات، آب وہوا کی خوشگواری، مناظر کا حسن، قدیم زمانے سے سیاحوں کے دامن دل کو اپنی جانب کھینچتا رہا بادشاہوں نے یہاں پر بار عیش کھولا اور خانقاہ بدوش صوفیا اس کے جمال دل افروز میں پا گرفتہ'' (نقش دوام ص ۱۵)

''بلند حوصلہ اخلاف نے اپنے مفاخر کی راہیں خود ہموار کی ہیں انہوں نے اسلاف کے بچھائے ہوئے دستر خوان سے زلہ ربائی میں کوئی عزت محسوس نہیں کی محمد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بے بنیاد مفاخر اور عرب وعجم کے مابین امتیازی خطوط کو اپنے رسالت سے اولین لمحہ میں حرف غلط کی طرح محو کر دیا تھا'' (نقش دوام ص ۲۱)

جاننے والے جانتے ہین کہ علوم دینیہ کا مقصود اور اس راہ میں تگ ودو کی آخری منزل نیت کی درستگی، اخلاص کی دولتِ بے بہا، معاملات کی صفائی، عبادات کا اہتمام، باطن کا تزکیہ اور اعمال کا تجلیہ ہے رمز آشنائے حقیقت مولانا روم علیہ الرحمہ نے جنکی مثنوی کے بارے میں اسرار باطن کے حاملین کا فیصلہ ہے کہ ''ہست قرآن درزبان پہلوی'' اپنے ایک شعر میں دینی علوم کا مقصد واضح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا

جان جملہ علمہا ایں است وایں
قابدانی من کیم دریوم دیں

''کہ تمام علوم کا حاصل اور منتہا یہی ہونا چاہئے کہ انسان کو عاقبت کی فکر اور زمرۂ سعدا، میں شریک ہونے کی بے قرار تمنا نصیب ہو غور سے اگر دیکھا جائے تو خود اسلامی دانسانی زندگی کا مقصد بھی اس کے سوا اور کوئی نہیں لیکن اسے کیا کیا جائے کہ برخود غلط انسان نے حقیقی منزل کو چھوڑ کر ان راہوں پر سرپٹ دوڑنا شروع کر دیا جو اسے مقصد سے قریب تر کرنے کے بجائے بھیانک اور مہیب وادیوں میں پہنچا رہی ہیں حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں احسانی کیفیات کا فیضان نہیں بلکہ عرفانی بارشیں آپ کے ابر نبوت ورسالت سے اس انداز میں ہو رہی تھیں کہ ریاضت

وتمرین کے بغیر خدا کے مقدس بندے تزکیہ وتجلیہ کی حقیقی دولتوں سے دامن مراد بھرتے لیکن آپ کی رحلت کے بعد زندگی کے دوسرے شعبوں میں جس طرح ایک مربوط ومنظم تعلیم کی ضرورت پیش آئی احسانی کیفیات کو حاصل کرنے کے لئے بھی ایک مرتب ومسلسل نظام کی ضرورت کھڑی ہوگئی تعلیم کے لئے درسگاہیں کھل گئیں جسکے مسند نشیں علماء اور استفادہ کرنے والے طلباء کہلائے تزکیہ کے لئے خانقاہی نظام وجود میں آیا جہاں دینے والے مرشد اور لینے والے مسترشد کے نام سے مشہور ہوئے'' (نقش دوام ص ۱۴۱-۱۴۲)

''دنیا میں لاکھوں چھوٹی بڑی لڑائیاں لڑی گئیں جن کی تاریخ بھی آج تک محفوظ چلی آتی ہے لیکن موت کو اپنی ایک ضرورت وتمنا کا درجہ دینا یہ صرف اصحاب النبی ﷺ کا کارنامہ ہے اسی طرح جب اسلامی ریاست کو حکمراں طبقہ کی ضرورت پیش آئی تو وہ مدبر طبقہ سامنے آیا جن کے ناخن تدبیر نے رشتہ کار میں پڑی ہوئی ہر گرہ کو کھول کر رکھ دیا بیدار مغز، بے لوث، عدالت پسند، زہد پیشہ، متوکل حکمرانوں کا ایسا گروہ جن کی نظیر پیش کرنے سے ماضی ومستقبل ہمیشہ عاجز وقاصر رہیں گے جن کی راتیں عبادت کے سوز وگداز سے آشنا جو دن کے جالے میں فقر پسند حاکم تھے'' (نقش دوام ص/۱۷۲)

ان کی تحریر کا تعلق صرف علمی، تحقیقی، دینی، مذہبی موضوعات سے ہی نہیں رہا بلکہ سیاست وسماج سے بھی تھا اور ان موضوعات پر بھی انہوں نے قلم فرسائی کی حالات حاضرہ اور پوری دینا کے احوال پر ان کی نظریں تھی اور ان عنوانات پر بھی وہ اپنے قلم کی طاقت صرف کرتے تھے اور یہاں بھی ان کی زبان اور لہجہ دوسروں سے مختلف اور علیحدہ تھا دیکھئے۔

''ہمارا ملک بھی عجیب روایات کا حامل ہے'' ہولی آتی ہے تو مسلم اقلیت کانپتی ہے رام لیلا کرشن میلہ سے تھراتی ہے میچ کرکٹ جو شروع سے آخر تک کھیل ہے اس میں

بھی ہار جیت مسلم اقلیت کی تباہی کی خبر لائی ۔افریقہ میں جیت پر جگہ جگہ فسادات،
''ہند میں رہنا ہوگا تو وندے ماترم کہنا ہوگا، کے دل آزار نعرے اور کشت وخون کی
ہولی یہ سانپ بلوں میں پل رہے تھے جن سنگھ پریوار نے بین بجا کر انہیں یکجا کیا اور
ڈسنے کی تعلیم وتربیت دی اب یہ زہرافشانی میں ماہر، زہر چکانی میں طاق موت کی نیند
سلانے میں تجربہ کار'' (محدث عصر اگست، ستمبر ۲۰۰۷ء)

''الیکشن کے موقع پر بے بنیاد نعرے، بے سود عہد و پیمان، رائے دہندگان کے جذبات
سے ناپسندیدہ عام بات ہے لیکن ایک ذلیل مقصد کے لئے عقل وخرد سے بیگانہ، صحیح فکر
سے محروم نعرہ بلند کرنا، اور کرنا کرانا کچھ بھی نہ ہونہ اس کا جواز اور نہ یہ مناسب بلکہ کروڑ ہا
کروڑ انسانوں کے امن اور دین پسند رجحانات پر شدید ضرب لگا کر اپنا الو سیدھا کرنا ہے
یہ وہی شخص کرسکتا ہے جس کے مطالبے میں موجود شیطان اپنی شیطنت کے مظاہرے کر
رہا ہے'' (محدث عصر جون/ جولائی ۲۰۰۷ء)

ان کا مطالعہ تو وسیع تھا ہی مگر اطراف وجوانب سے باخبر بھی تھے اور صرف ملکی
مسائل پر ہی وہ واقفیت نہیں رکھتے تھے بلکہ بین الاقوامی سطح کے معاملات اور بدلتے
حالات پر بھی ان کی توجہ تھی اور ان کے مخفی و پوشیدہ گوشوں کا بھی انہیں ادراک تھا
باہوش تھے اپنی فہم وفراست سے گہرائی میں اتر کر رائے قائم کر لینا بھی ان کے لئے
آسان ہوتا تھا میں نے قریب سے دیکھا کہ کسی معاملے میں انہوں نے کوئی رائے قائم
کی اور کافی لوگوں کی رائے ان کے خلاف رہی مگر انجام کے اعتبار سے ان ہی کی رائے
بھاری پڑی ان کی تحریروں میں بھی یہ خصوصیت جھلکتی ہے جرأت کے ساتھ اپنی بات
کہتے تھے اور مصلحتوں کے شکار نہ ہوتے تھے مقامی وغیر مقامی ملکی وغیر ملکی احوال پر ان
کے بےلاگ بتصرے اور جرأتمندانہ تحریریں اس کا احساس دلاتی ہیں کہ وہ سودا کرنے
کے عادی نہ تھے ایسا بھی ہوا کہ ہم نے (میں اور مولانا سید احمد خضر شاہ صاحب) ان

سے کسی مسئلہ کی نزاکتوں پر نظر ڈالنے کی درخواست کی، رائے کی تبدیلی پر آمادہ کرنا چاہایا موقف میں نرمی اختیار کرنے کی بات کی تو انھوں نے دلائل کی روشنی تمام کو ششوں کو پانی کر دیا زبان اور قلم دونوں جگہ ان کا موقف یکساں رہتا تھا اور پھر عمل کی توانائیاں بھی اس پر صرف کر دیتے تھے۔

شخصی مضامین لکھنا اور ان میں بھی یہ خوبی کہ وہ خاکہ نگاری کا مرقع بھی ہوں اور شخصیت کے تمام پہلوؤں کی بھی اجمالاً اور کبھی تفصیلاً اجاگر کیا گیا ہو مشکل کام ہے ''لالۂ وگل'' ان کے شخصی مضامین کا مجموعہ ہے اور اہم خطوط بھی اس میں شامل کئے گئے ہیں ان میں اکثر وہ لوگ شامل ہیں جن کو شاہ صاحب نے دیکھا یا ان سے روابط اور تعلقات رہے چند ہی نام ایسے ہیں جو مشہور عالم ہیں اور علم وفضل کے کوہ گراں ہیں مگر ان کو دیکھنے کا موقع انہیں نہیں ملا ان کی شخصیت نگاری کے بھی چند نمونے دیکھئے۔

''حضرت نانوتوئیؒ ازہر الہند دارالعلوم دیوبند کے بانی نہیں بلکہ فکر کے امام ہیں وہ صرف ایک عالم نہیں بلکہ جنود ربانیہ کے سپہ سالار ہیں وہ ایک فرد نہیں بلکہ وقت کی امت ہیں انھوں نے دارالعلوم قائم کر کے پچھلوں کو وہ متاع بے بہا عنایت فرمائی جسکے بار احسان سے اخلاف کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے وہ کیا تھے؟ داعی الی اللہ، متکلم اسلام، متکلم دین، حکیم الاسلام، محدث ومفسر، فقیہ ومناظر، عالم باعمل، درویش صفاکوش، فقیر خرقہ پوش، اسرار شریعت کے ایسے بحر ناپیدا کنار جس نے عقائد اسلام میں پیدا کردہ رخنوں کی درستگی میں اپنی حیات طیبہ کا ایک ایک لمحہ صرف کیا آپ کے علوم کتابی نہیں بلکہ کمالات وہبی ہیں پھر ان معارف کو ایسی زبان سے ادا کیا جس کی کاٹ شمشیر براں سے تیز ہے'' (لالۂ وگل: ص: ۳۱-۳۲)

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کے بارے میں تحریر فرمایا:

''وہ اپنے دائرہ فکر ونظر اس ایک ایسی انفرادیت کے حامل تھے جس کا رنگ نہ کسی

ادیب کی نگارشات میں دکھائی دیتا ہے اور نہ اس کی مہک کسی اہل قلم کی تحریروں میں نظر آتی ہے علمی تحقیقات کو خاص انداز میں پیش کرتے اور وسیع معلومات کو اچھوتے اسلوب میں ڈھالنے کا جو سلیقہ ان کو عطا کیا گیا تھا آج انھیں کے ساتھ گیلانی کے ایک گوشہ میں دفن ہوگیا'' (لالۂ وگل :ص:۹۵)

حضرت مولانا فخر الدین علیہ الرحمۃ پر قلم نے یوں جولانیاں دکھائیں:

''علمائے روزگار کا مخزن، فضلائے دہر کا معدن، نامور شخصیتوں کا مرقع، علوم وفنون کا مرکز، اے خوش نصیب دارالعلوم مبدار فیاض نے تجھے کن کن گوہر ولآلی سے نوازا اور کیسے کیسے آبدار تابدار موتیوں سے تیرا دامن لبریز ہے تو صبح چمن ہے کہ بادنسیم تیری روشوں پر مصروف خرام تو ایسا سدابہار گلشن ہے کہ تیرے پھولوں کا منھ دھلانے کے لئے شبنم بلندیوں سے اترتی ہے یہ زبان استعارہ وتشبیہ کی ہے ورنہ تیرے لئے سب کچھ وہ فخر وزگار شخصیتیں ہیں جنکی نظیر اب چشم فلک نہ دیکھ سکے گی انہیں میں تیری ماضی قریب کے مسند آرا، حدیث وزینت بخش تخت علم وفن مولانا فخر الدین علیہ الرحمۃ بھی تھے'' (لالۂ وگل ص ۱۰۷)

حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی شخصیت پر یوں رقمطراز ہوئے:

''خانوادۂ قاسمی کے گوہر شب چراغ، چمنستان قاسمی کے گل سرسبد، سحر البیان مقرر، واعظ ہزار داستاں، نکتہ آفریں، نکتہ شناش، پرانی روایات کے حامل لیکن جدت سے بھی نفور نہیں بلکہ قدیم وجدید کے سنگم، ایسے دریا جس میں ہر طرح کی ندیاں آکر گھل مل جائیں، خوش رو بلکہ مغل شاہزادوں کی طرح خوب رو، خوش پوشاک، قامت ایسا زیبا کہ ہر لباس ان کے بدن پر بہار دیتا، روئی کے گالے کی طرح سفید، بڑی آنکھیں جن پر دبیز پلکوں نے خوشنما سائبان کی شکل اختیار کی تھی چہرہ پر معصومیت کا نور، خلوت وجلوت میں فرشتوں کے ہجوم میں رہتے جس مجلس میں پہنچتے صدر نشیں جس محفل میں در آئے تو مسند

آرار، حلم وتحمل صبر وضبط پوری زندگی پر حاوی، عفو درگذر زندگی کے ہر شعبہ ومنزل میں نمایاں، ساٹھ سال سے زائد دارالعلوم کا اہتمام کیا اور اسے جہانگیر بنایا شرق وغرب کے سفر کئے اور دارالعلوم کی آفاقیت کے پھریرے اڑائے'' (لالۂ وگل ص ۱۲۸)

حضرت مولانا یوسف بنوری صاحبؒ کی شخصیت پر ان کے قلم نے یوں جلوے بکھیرے:

''خوش رو، خوش پوشاک، خوش مزاج، خوش نہاد، نفاست پسند، نظیف الطبع، ذکی وذہین متیقظ، حافظہ بے نظیر، ذکاوت بے مثال، عالم فاضل محدث، مفسر حضرت علامہ کشمیریؒ کے وہ بااختصاص شاگرد جن پر علامہ کا علم ناز کرتا ہے وہ تلمیذ سعید جس پر استاذ کی روح پرفتوح نازش کرتی ہے''۔ (لالۂ وگل ص ۱۴۷)

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروئیؒ پر یہ چند جملے ملاحظہ فرمائیے

''شعلہ جوالہ، بلکہ آتش فشاں، حریت کوش، آزادی کی جنگ میں سینہ سپر سالار، ملت کے غم خوار ملک کے غمگسار، عالم فاضل، انشاء پرداز، مصنف، مؤلف، حضرت علامہ کشمیریؒ کے بااختصاص شاگرد، سیاسی بصیرت ممتاز، تقریر میں بے مثال، حاضر جواب، معاملہ فہم، سیاسی گتھیوں کو چٹکی بجاتے حل کرتے، تقریر کے لئے کھڑے ہوتے تو دونوں ہاتھ شیروانی کی اوپر کی جیب میں اس کے بعد محسوس ہوتا کہ ریکاڈ شدہ تقریروں کا کیسٹ کھول دیا گیا'' (لالۂ وگل ص ۱۷۳)

ان کے سدابہار قلم سے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا یہ مختصر تعارف بھی پڑھتے چلئے:

''مشہور انشاء پرداز، ادیب طناز، مفسر، مورخ، بزرگ صحافی، حضرت تھانویؒ کے مجاز، تحریک خلافت کے مضبوط رکن، رئیس الاحرار محمد علی جوہر کے ہم نشیں، حق گو، حق پسند، انشاء میں بے مثل، طنز میں لاجواب، چند جملوں میں مقابل وحریف کے چھکے چھڑا دیتے''۔ (لالۂ وگل ص ۲۴۱)

لالۂ وگل کے مختصر اور طویل مضامین میں ایسے لاتعداد نمونے موجود ہیں ان کی

تحریروں کی بلندی، فن کی عظمت اور انشار کی انفرادیت آسمان کی اونچائیوں کو چھوتی ہے اور قدم قدم پر یہ احساس دلاتی ہے کہ قدرت نے ان کو جو سلیقہ وقرینہ عنایت فرمایا تھا اس میں کسی دوسرے کی شرکت نہیں تھی اور جو دولت نے انہیں ملی تھی اس کو انہوں نے چابکدستی، فنی مہارت کے ساتھ مثبت اسلوب میں خرچ کیا وہ بلاشبہ البیلی اور نرالی تحریروں کے خالق تھے انکی تحریریں ہمیشہ زندہ رہیں گی اور ان کا رنگ کبھی پھیکا نہیں ہوگا۔

بہت بار ایسا ہو کہ ان کا پیغام پہونچا کہ بعد نما مغرب مجھ سے ملو حاضر ہوا تو فرمایا کچھ لکھنا ہے وہاں کاغذ قلم رکھا ہوا ہے اٹھالو اب وہ بولنا شروع کرتے تو سنبھالنا اور ضبط کرنا مشکل ہو جاتا آمد اس بلا کی کہ ٹھہرنا اور رکنا تو جانتے ہی نہ تھے ہاں یہ کرم ضرور فرماتے کہ ایک ایک جملہ کئی بار دہراتے میری کتاب ''خطبات شاہی'' تیار تھی اس پر رائے لکھونے کیلیۓ حاضر ہوا تو بلا تکلف بولتے چلے گئے اور میں لکھتا گیا اختتام مضمون پر میں نے عرض کیا عنوان مضمون بھی تجویز فرمادیجئے فوراً گویا ہوئے ''شورش عندلیب'' ایک ''لمحہ کو میں نے انہیں دیکھا اور وہ اسی لمحہ میرے دیکھنے کا مفہوم سمجھ گئے اور فرمایا'' نغمہ عندلیب'' لکھو یہ ان کی ذہانت اور مقابل کی بات کو سمجھنے کا ملکہ تھا کہ لمحہ بھر میں جان گئے میں کیا کہنا چاہتا ہوں الفاظ کی دروبست، جملوں کی ساخت وترکیب، تشبیہات واستعارات کی معنویت پر پوری طرح آگاہ تھے قدیم وجدید اردو ادب میں جو فرق آیا ہے اور زبان وبیان کے جو نئے سانچے ڈھلے ہیں ان سے بھی ان کی واقفیت گہری تھی یہ وجہ ہے کہ ان کی زبان ماضی کی داستان نہیں حال کا بیان ہے اور تحریر کی خوبی یہی ہے کہ وہ ہر دور میں نمائندگی کرتی رہے ایسا نہ ہو کہ وقت گذرا اور وہ تحریر طاق نسیاں ہوگئی۔

❀ ❀ ❀

شاہ صاحب کی شانِ خطابت

تحریر کا عالم تو آپ نے دیکھ ہی لیا ذرا خطابت کی طرف دھیان دیجئے دیو بند اور دار العلوم سے نسبت کی بنار پر بہت سے خطیب اور مقرر سننے کو ملے بلکہ دیو بند سے باہر بھی جن معروف خطیبوں کا چرچا رہا ہے ان میں سے بھی اکثر کو سننے کا اتفاق ہوا۔

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ کئی لوگ تھے خطابت نے جن کی آغوش میں جلا پائی اور ایسے مقررین بھی سننے میں آئے جن کی تقریروں کا رنگ اور مزہ الگ تھا ان میں سرفہرست حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی ذات گرامی خطابت کی دنیا میں اختصاص کی مالک تھی دھیما لہجہ، آواز درمیانی نہ انتہائی پست اور نہ بے انتہا گرج دار، سہل وسبک بیان اور دریا کی سی روانی بپھرنا اور ابلنا تو انہوں نے جانا ہی نہ تھا یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ان جیسا کوئی دوسرا خطیب ہماری صف میں نہ تھا مگر بات یہاں پر آکر ٹھہرتی ہے کہ شاہ صاحب کی سی شان رکھنے والا خطیب دوسرا کون ہے جواب یہ نکل کر آتا ہے کہ کوئی نہیں پھر یہ سوال بھی ساتھ ساتھ لگا ہوا ہے کہ اس سے تو سبھی کی نفی ہو رہی ہے نہیں ایسا نہیں ہے ہاں یہ بات بلاخوف تردید کہی جائے گی کہ خطابت کا جو آہنگ اور پرداز شاہ صاحب کا تھا وہ کسی اور کا نہیں بالکل الگ اور شاہانہ، جیسا مزاج، جیسی طبیعت، جیسی تدریس اور جیسا انداز تحریر بالکل وہی کیفیت خطابت کی بھی تھی ۔وہاں بھی سب جگہ ان کا امتیاز برقرار اور یہاں بھی ان کا معیار بلند اور مختلف، عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ بہت سے مقررین کی تقریریں اسٹیج پر تو بے مثال ثابت ہوتی ہیں اور عرصۂ دراز تک ان کی گونج سنائی دیتی ہے جب تک خطیب خطاب کر رہا ہوتا ہے دیوانوں کا ہجوم بڑھتا ہے اور نعرۂ تکبیر کی صداؤں سے ماحول گرمایا رہتا ہے مگر

جب وہی تقریر کاغذ پر منتقل ہوتی اور کبھی طباعت کے مرحلہ سے گذرتی ہے تو اس سے زیادہ بے جان کوئی چیز نہیں ہوتی شاہ صاحبؒ کی خطابت کی خوشبو اور تقریر کی مہک کاغذ کے سینے پر بھی مسحور کرتی ہے وہی روانی، وہی جوش وجذبہ، وہی تاثیر اور اپنی گرفت میں لے لینے کا وہی زور اور تیور، شاہ صاحب کی تقریروں کے کئی مجموعے منظر عام پر آئے جیسے گل افشانیٔ گفتار اور خطباتِ کشمیر وغیرہ تمام ہی جگہوں پر وہی عالم ہے جس کو میں نے بیان کیا۔اس دعوی کیلئے دلیل کی ضرورت ہے اور اس کیلئے ان کے خطبات اور تقریروں کے چند اقتباسات پیش ہیں۔

''بزرگو! توحید کو سمجھانے کے لئے میں نے کچھ واقعات آپ کے سامنے ذکر کئے اسلامی احکامات کی کچھ خصوصیات ذکر کیں توحید یہ بھی ہے کہ نافع، ضار، شافی، رزاق، مسبب الاسباب، قاضی الحاجات، رفیع الدرجات سب کچھ خدا کو سمجھئے نہ کسی نبی کو نہ کسی ولی کو، نہ کسی پیر کو، نہ کسی بادشاہ کو نہ کسی وزیر کو'' (خطبات کشمیر/ص ۲۷)

''بھائیو! انسان مختلف کیفیات کا مجموعہ ہے شرافت ورذالت، سخاوت وبخل، شجاعت وبزدلی، حیا اور بے حیائی، فضول خرچی کفایت شعاری، ایسے ہی بہت سے انسان بڑے غصیارے اور بہت سے ریشم سے زیادہ نرم، موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں طمانچے کا جواب تھپڑ تھا جبکہ عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات میں اگر کوئی گال پر ایک طمانچہ مارے تو اپنا دوسرا گال بھی پیش کردو اگر کوئی تمہارا کرتا اتارے تو اپنا جبہ بھی دیدو اسلام میں اعتدال ہے نہ کوئی چیز بڑھی ہوئی اور نہ کوئی چیز گھٹی ہوئی بزدلی کو ناپسند کیا گیا، شجاعت پسندیدہ ہے بڑھی ہوئی شجاعت ناپسند ٹھہری، فضول خرچی سے روکا گیا سخاوت کو سراہا گیا''۔ (خطبات کشمیر/ص ۳۷)

''کون کہتا ہے کہ دیوبندی اولیاء اللہ کو نہیں مانتے یہ الزام ہے، بہتان ہے ہم سے زیادہ کوئی اولیاء اللہ کو نہیں مانتا دیوبند کا امتیازی یہی ہے علم ولایت مدرسہ وخانقاہ قال اللہ

قال الرسول، اللہ ھواللہ شروع ہی سے خانقاہ ہمارے یہاں چلی آرہی ہے گنگوہ میں قطب العالم حضرت مولانا رشید احمدؒ کی خانقاہ، تھانہ بھون میں حضرت مولانا اشرف علی کی خانقاہ، رائے پور میں حضرت شاہ عبدالرحیمؒ وحضرت شاہ عبدالقادر کی خانقاہ، سہان پور میں حضرت مولانا خلیل احمدؒ کی خانقاہ، دیوبند میں شیخ الہند مولانا محمود حسن کی خانقاہ ۔میرے والد مرحوم حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے ایک بار طلبا ء سے فرمایا ہم کشمیر سے دیوبند آئے تو دین ہم نے حضرت گنگوہیؒ کے یہاں دیکھا پھر دین حضرت شیخ الہندؒ کے یہاں دیکھا اب جس کو دین دیکھنا ہوتو وہ تھانہ بھون چلا جائے تو بھائی دین مکمل نہیں ہوتا تاوقتیکہ تصوف نہ ہو جبرئیل علیہ السلام نے آنحضور ﷺ سے ایمان واسلام کے بارے میں پوچھا تو احسان کے بارے میں بھی دریافت کیا کہ یہ احسان ہی سلوک وتصوف ہے اور دین کا اہم ترین مسئلہ ہے" (خطباتِ کشمیر/ص ۲۳-۲۴)

"پس وطن کی نسبت بھی اہل وطن کو معزز کر دیتی ہے تو دین اسلام کا وطن یہی مقدس شہر ہیں تو اس پاکیزہ نسبت سے دین افضل ٹھہرا اور اس کا شرف کھینچ کر حامل دین امت تک پہنچ گیا نتیجہ امت خیر الامم ہوگئی" (خطباتِ کشمیر/ص ۱۴۴)

حدیث میں ہے کہ قرب قیامت میں فتنے موسلا دھار باش کی طرح برسیں گے اس وقت دین کو تھامنا اتنا مشکل ہوگا کہ آدمی ننگے پیر انگاروں پر کھڑا ہوسکتا ہے لیکن دین پر جمنا آسان نہ ہوگا یہ بھی فرمایا کہ صبح کو گھر سے نکلے گا تو مومن ہوگا شام کو لوٹے گا تو کافر ہوگا شام کو مومن ہوگا تو صبح کو اس طرح طلوع کرے گا کہ کافر ہو چکے گا اللہ تعالیٰ ان فتنوں سے مجھے اور آپ کو بچائے۔

آج فتنے ابل رہے ہیں فتنہ عورتوں کا، فتنہ فیشن کا، فتنہ مال کا، فتنہ اولاد کا، فتنہ گانے بجانے کا، فتنہ اقتدار کا، فتنہ دولت کا، فتنہ تحریر کا، فتنہ تقریر کا، فتنہ عقائد کا، بدعت کا ،ایک فتنہ ہو تو ذکر کروں ان گنت فتنے ہیں اور ہم ان میں پھنسے ہوئے

ہیں''۔(خطباتِ کشمیر/ص۱۶۴-۱۶۵)

''زندگی خود پیغام ہے کہ جدوجہد کا میدان کھلا ہوا ہے کشادہ بلکہ کشادہ تر یہاں ماضی کو فراموش کیجئے، حال کو گرمایئے، مستقبل کی تابناکیاں تلاش کیجئے، اٹھئے، چلئے، حرکت کیجئے آپ کو محنت سے لگاؤ ہو ترکِ عمل سے عداوت، تعطل سے نفرت، سراپا جہد، یہ کیا کہ ماحول ناموافق ہے یہ کیا زبان پر آیا کہ گردوپیش نامساعد ہیں، یہ کیوں سوچا کہ حالات کٹھن ہیں ہمت مردانہ سے کام لیجئے اور یہ کہتے ہوئے مردانہ وار آگے بڑھئے''۔

حدیث بے خبران ہے کہ تو بازمانہ بساز
زمانہ باتو نسازد تو بازمانہ ساز

منھ میں زبان ہے اسے کاٹنے والی قینچی نہ بنایئے بلکہ یہ برگ گل ہے جس کی لطافت سے دشمن کے دل جیتے جاسکتے ہیں۔(خطبات کشمیر:ص:۱۸)

''موت بھی ایک پیغام ہے کہ یہ زندگی کی آخری منزل ہے دوڑتی بھاگتی دنیا کا یہ آخری مستقر ہے شاندار بنگلوں، فلک نما کوٹھیوں، شاہی محلات، فقیر کی جھونپڑی، نادار کا جھونپڑا سب کچھ کے بعد یہی شہرِ خموشاں، یہی تو دہٗ خاک جسے موت کا کھٹکا لگا ہے جو زندگی کی چمک دمک کے بعد طویل تاریکی کا قائل ہے نہ وہ غرور میں مبتلا ہوگا نہ اکڑفوں اس کے قریب آئیگی نہ نشۂ اقتدار اسے مدہوش کر سکے گا''
(خطباتِ کشمیر/ص:۱۸۱)

ان اقتباسات سے آپ کو شاہ صاحب کی خطابت کو سمجھنے میں آسانی ہوئی ہوگی اور اس میدان میں ان کے ممتاز ہونے کی بات درست لگی ہوگی بہت سے خطیب اس خبط کا شکار ہو جاتے ہیں کہ وہ جب بولیں تو نئی بات بولیں اور وہ بات کہنے کی کوشش کریں جو انوکھی ہو یا جسکی جانب کسی اور مقرر کا دھیان نہ جائے سو وہ ایسی مہمل اور فلسفیانہ بات کہہ جاتے ہیں کہ سامعین ہونقوں کی طرح خطیب کی صورت دیکھتے ہیں

شاہ صاحب عام بات کو بھی اپنے مخصوص لب ولہجہ سے کچھ کا کچھ بنا دیتے تھے او سننے والا سمجھنے کے ساتھ ساتھ محظوظ بھی ہوتا اور مبہوت بھی رہتا جس مضمون کو وہ اختیار کرتے اس کے بارے میں یہ کہنا بجا ہے۔

دہر میں مجروحؔ! کوئی جاوداں مضموں کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

ان کی زبان سے ادا ہونا ہی بے شمار مضامین وعنوانات کی جاودانی کا سبب بن جاتا تھا ان کی خطابت کا عالم یہ تھا جو کسی شاعر نے کہا ہے

ہونٹوں کو وقتِ گفتگو چومتی تھی شگفتگی
بات جو تھی وہ پھول تھی پھول جو تھا گلاب تھا

یقیناً ان کی زبان سے پھول جھڑتے تھے ان کے لہجہ کی مٹھاس، زبان کی شیرینی اور بیان کا ذائقہ زمانوں تک باقی رہا اور باقی رہے گا!

❁ ❁ ❁

شاہ صاحبؒ کے ساتھ چند سفر

شاہ صاحبؒ کے اسفار بھی شاہانہ انداز کے تھے اور یہاں بھی ان کا رنگ غالب رہتا تھا احقر کے کئی سفر ایسے ہوئے جس میں شاہ صاحبؒ کو اور زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا پہلا سفر تو دیوبند سے دہلی ہی کا تھا جو اپنے معمولی فاصلے کے اعتبار سے قابل ذکر بھی نہیں ہے مگر ۱۹۷۷ء میں مدراس جانا ہوا جو دیوبند سے مسافت کے اعتبار سے بھی دور ہے اور قیام بھی لگ بھگ دس روز رہا پھر کشمیر کے بھی کئی سفر ہیں جو زیرِ قلم آئیں گے۔

یہاں شاہ صاحب کے عقیدت مندوں، چاہنے والوں کی محبت اور والہانہ پن کے بے شمار مناظر ذہن میں تازہ ہیں پورے مدراس، بنگلور میل وشام وغیرہ کے علاقوں میں ان کی حکمرانی کا زرّیں دور چل رہا تھا اور ان کی یہ حکمرانی آخر زمانے تک قائم رہی ان کی ایک آواز پر صد ہا لوگ دوڑتے اور ان کی زبان سے ادا ہونے والی ہر بات پر عمل ہر شخص اپنی سعادت تصور کرتا یہاں ان کے میزبان مشہور تاجر چرم خضر صاحب مرحوم تھے اور ان کے وصال کے بعد یہ سعادت ان کے فرزندان الحاج ہاشم سیٹھ صاحب عبدالحلیم صاحب مرحوم اور سلیم صاحب مرحوم کے حصہ میں آئی ان تینوں برادران نے تعلق ومحبت کا کوئی گوشہ ایسا نہیں چھوڑا جہاں شکایت کے دروازے کھلیں خاص طور پر سلیم صاحب مرحوم تو شاہ صاحب کی محبت میں غرق تھے ان کے مزاج میں شدت اور اپنی بات کو منوانے کا جذبہ شدید تھا مگر شاہ صاحبؒ کے راحت وآرام کا بھرپور خیال رکھتے ناراضگی کا تو تصور بھی نہیں تھا شاہ صاحب کی معمولی سی خفگی اور ناگواری بھی ان کے لئے سوہانِ روح بن جاتی تھی۔

تینوں بھائی ان کے سامنے بچھے جاتے سلیم صاحب تو دوڑ دوڑ کر شاہ صاحبؒ کے

کام انجام دیتے اور اگر کسی وقت شاہ صاحبؒ کو کبیدہ محسوس کرتے اور دونوں بھائیوں میں سے کوئی اس کا سبب بنتا تو سلیم صاحب کا پارہ آسمان پر ہوتا پھر چاہے ہاشم سیٹھ ہوتے یا عبدالحلیم ان کے غیض وغضب کا نشانہ بنتے سلیم صاحب چند سال ہوئے ایک حادثہ کا شکار ہوکر موعود حقیقی کی طرف لوٹ گئے تو اپنے اس فداکار کے حادثۂ وفات کو شاہ صاحبؒ نے شدت کے ساتھ محسوس کیا اور فوری طور پر بذریعہ ہوائی جہاز مدراس تشریف لے گئے۔

اس سفر میں ہر روز شاہ صاحبؒ کی کئی کئی تقریریں ہوتیں مختلف عنوانات پر بیانات ہوتے کبھی کسی فیکٹری کا افتتاح، کسی دکان کا آغاز، کسی مکان کی بنیاد، کسی مدرسہ اور مکتب کا معائنہ، کسی مسجد کی تعمیر مکمّل ہونے کی تقریب، کسی کا نکاح تمام جگہوں پر شاہ صاحبؒ کے جلوے دکھائی دیتے دس دن کا یہ سفر ایک یادگار سفر تھا عوام وخواص کا رجوع اور ان کے دیوانوں کا ہجوم سنبھالے نہیں سنبھلتا تھا اور جس جگہ وہ پہنچتے ان کے استقبال کرنے والوں کا جذبہ قابل دید ہوتا۔

کشمیر کا وہ سفر جو علامہ انور شاہؒ سیمنار کے عنوان سے ہوا جس میں مشاہیر علماء، اہل قلم، اور دانشور حضرات نے شرکت فرمائی وہیں حضرت بڑے شاہ صاحبؒ کے تلامذہ او راہل خاندان کی بھرپور نمائندگی رہی اور ہفتہ بھر کا یہ سفر اہل علم کے اس قافلہ اور اولا دو احفاد کے اس کارواں کی زندگی کا ایسا سفر تھا جس کو تصور اور خیال میں بھی لانا ممکن نہیں جنت ارضی کے پرکیف مناظر، حسین وخوبصورت وادیاں، سرسبز وشاداب پہاڑ، پھلوں اور میووں سے لدے درخت، کشمیر کے معروف اور لذیذ کھانے، اہل کشمیر کی میزبانی اور عقیدتوں کا اپنا روایتی انداز، کشمیر کے وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ، وزیر اوقاف مرزا افضل بیگ، مولانا محمد سعید مسعودی، میر واعظ مولانا فاروق وغیرہ جہاں خصوصی میزبان تھے وہیں پورا کشمیر حضرت شاہ صاحب کے دونوں فرزندوں مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر مرحوم اور مولانا سیّد انظر شاہ صاحبؒ کو کاندھوں پر اٹھائے اٹھائے پھرا وہاں بھی مختلف اجتماعات میں شاہ

مولانا محمد سعید مسعودی، میر واعظ مولانا فاروق وغیرہ جہاں خصوصی میزبان تھے وہیں پورا کشمیر حضرت شاہ صاحب کے دونوں فرزندوں مولانا سید محمد از ہر شاہ قیصر مرحوم اور مولانا سیّد انظر شاہ صاحبؒ کو کاندھوں پر اٹھائے اٹھائے پھرا وہاں بھی مختلف اجتماعات میں شاہ صاحبؒ کے خطابات ہوئے سری نگر کی عظیم الشان جامع مسجد میں والد مرحوم کا بھی خطاب ہوا گو تقریر کے آدمی نہ تھے مگر مولانا سید انظر شاہ صاحبؒ کے الفاظ میں۔

تقریر اگرچہ ان کا پیشہ نہیں تھا مگر اس میدان میں بھی عاجز نہ تھے جب کھڑے ہوتے تو رواں دواں بولتے محسوس ہوتا کہ الفاظ کا ذخیرہ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہے (لالہ وگل صفحہ ۳۴۴)

اور ابھی چند سال پہلے کشمیر ہی کا ایک اور سفر ہوا یہ دور کشمیر میں شاہ صاحبؒ کی بلا شرکت غیرے حکمرانی کا دور تھا کیا بادشاہوں کا استقبال ہوتا ہوگا اور کیا سربراہانِ مملکت کی پذیرائی ہوتی ہوگی دنیا میں مقبولیت اور ہر دلعزیزی ہر کسی کا مقدر نہیں بنتی شاہ صاحبؒ کو خداوندِ عالم نے خوب خوب اپنے لطف وکرم سے نوازا تھا اور جہاں ان کے قدم پڑتے جنت ارضی کے حسن میں اضافہ ہو جاتا۔ سفر میں بھی شاہ صاحبؒ اپنے مزاج اور پسند کے مالک تھے، اور سب ہی لوگ ان کی طبیعت کے مطابق انتظامات کیا کرتے صاف ستھری رہائش گاہ، اجلے بستر اور خدمت کے لئے ہر لمحہ کوئی نہ کوئی موجود، ان کے آرام وراحت کا بھرپور خیال رکھا جاتا بلکہ اضافی انتظامات کئے جاتے یقیناً اس انداز کے اسفار دوسرے لوگوں کا نصیب نہیں بنے ہونگے اور اگر بنے تو کبھی کبھی کے درجہ میں رہے جبکہ شاہ صاحبؒ کا معاملہ ہمیشہ یہی رہا۔

شاہ صاحبؒ کا اگر سفر میں کسی ایسے میزبان سے سابقہ پڑتا جو صفائی ستھرائی کا خیال نہ رکھتا ہو، اوقات کی پابندی کا جسے لحاظ نہ ہو یا ہر وقت سر پر مسلط رہتا ہو تو ایسے میزبان کو مہمان نوازی کا دوسرا موقع نہیں ملتا تھا ان کی کچھ اور طلب نہ تھی جس جگہ کا ان

کا سفر ہوتا داعی حضرات سے وہ یہی معاملہ طے کرتے تھے اور ان کی مہمان نوازی کی شرائط پر جو پورا اترتا تھا وہاں بار بار کے سفر سے بھی انھیں تامل نہ ہوتا تھا طبیعت میں نزاکت تھی اس لیے معمولی کوتاہی بھی ان کے لیے سوہانِ روح بن جاتی تھی۔

وہ نہ خود کسی پر بوجھ بننا چاہتے تھے اور نہ خود کو تعب میں ڈالنے کے عادی تھے۔ اس لیے ان کی ہر ممکن کوشش یہ ہوتی تھی کہ جہاں تک ہو سکے معاملات صاف ستھرے رہیں۔اور فریقین کو زحمت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔میرا خیال ہے کہ اس سمت میں ان کی سوچ بالکل درست اور صحیح تھی۔ورنہ ہوتا یہ ہے کہ میزبان اور مہمان دونوں ہلاکت میں پڑ جاتے ہیں۔اور زورزبردستی عمدہ اخلاق کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔

یادگارِ محفل رونق تھی پروانے کی خاک

جسم مر جاتا ہے انسان کا کردار کہاں
موت ہر حال میں ہو موت ضروری تو نہیں

عم محترم حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب مسعودیؒ نے کیا آنکھیں موندیں تاریخ نے آنکھیں موندلیں اور روایتیں جاں کنی کی کیفیت سے گزرنے لگیں، جوش، جذبے اور ولولے کی موت ہوئی، خطابت، تدریس، تحریر کی پاکیزگی، تقدس اور جامعیت کا وہ پہاڑ اپنی جگہ سے کھسک گیا جس کے سائے میں علم کے قافلے آکر ٹھہرتے اور طالبانِ علوم نبوت سکون اور اطمینان کی سانس لیا کرتے تھے، گذشتہ ۵۰رسال میں ہزاروں اساتذہ، بے شمار ماہرین فن اور علوم عقلیہ ونقلیہ کی ممتاز شخصیات نظروں کے سامنے سے گذر گئیں اور بے شمار اب بھی موجود ہیں ان میں کافی تعداد ان لوگوں کی ہے جو آج بھی دارالعلوم میں تدریس سے وابستہ ہیں، نوجوان ہوں یا ادھیڑ عمر، عمر رسیدہ ہوں یا زندگی کی آخر منزلوں میں قدم رکھنے والے سب کی موجودگی میں شاہ صاحب کا جادو سر چڑھ کر بولا اور سب کو یہ احساس رہا کہ شاہ صاحبؒ کے انداز، آہنگ، اسلوب، بیان، درک، افہام و تفہیم، وسعت مطالعہ، دقت نظر تک رسائی ان کے بس کی بات نہیں یہ کسی کی تضحیک نہیں اس حقیقت کا اظہار ہے جسے ہم نے گذشتہ ۴۰رسال میں دیکھا اور جو ہر دم ہمارے مشاہدہ میں رہی۔

دراصل شاہ صاحبؒ نے روایتی خشک انداز کو ایک لہجہ عطا کیا اور خوش بیانی اور خوش مزاجی کے خوبصورت امتزاج سے ایک ایسی طرح ڈالی جو دوسروں کے لیے ناممکن تھی اور کوئی اسے اختیار کرنے پر بھی قادر نہ تھا پھر ان کی گفتگو اور مسحور کن انداز بھی

دوسروں پر مرعوبیت طاری کر دیتا تھا قادرالکلام حضرات بھی ان کے سامنے پہنچتے اگر ہکلاتے نہیں تھے ہچکچاہٹ ضرور محسوس کرتے تھے، لوٹتے تو یہ خیال ان کے دل ودماغ میں گھر کر لیتا تھا کہ شاہ صاحبؒ کا سامنا کم سے کم ہو اور اگر ملاقات ناگزیر ہو جائے تو مختصر کلام پر اکتفار کیا جائے، دیوبند میں بہت سے لوگوں نے ان ۲۷، ۲۸ سال میں خاص طور پر اس کا اہتمام کیا کہ ملاقات تو دور کی بات وہ سامنے آنے سے بھی گھبرائے اور ان کے وصال پر دعار وایصال ثواب کا معاملہ کر کے اپنے گھر بیٹھ گئے۔

یہ معمولی بات نہیں ہے یہ شاہ صاحبؒ کی عظمتوں کا خاموش اعتراف ہے کہ ہزار، ہزار طلبہ کے درمیان اپنی تدریسی ذمہ داریاں نبھانے والے ان سے اس درجہ مرعوب تھے، شاہ صاحبؒ بلا شبہ ایک اونچی اور عظیم نسبت رکھتے تھے اور امام العصر علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ کے فرزند وجانشین ہونے کی بنار پر ان کے لیے زندگی کے راستے زیادہ کٹھن اور دشوار نہ تھے، لیکن اگر صرف نسبتوں کا ہونا کامیابی کی ضمانت ہوتا تو آج ہر نسبت زندہ اور قوی ہوتی اور اپنی اپنی نسبت کے بل پر سب عظیم بن جاتے، ایسا نہیں ہوا اور نسبی تعلق کے باوجود بہت سے گھرانے دیکھتے ہی دیکھتے گمنامیوں کا شکار ہو گئے اور علم وعمل سے محرومی نے ان کے خاندان کو جیسے ہمیشہ کے لیے گم کر دیا، شاہ صاحبؒ کا امتیاز یہ تھا کہ انہوں نے ذاتی محنت، جدوجہد، عزم وحوصلہ اور فضل وکمال کے ذریعہ اس نسبت کو قوت بخشی اور اپنی موجودگی کو بھی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیا، دوسروں کی محنت پر انحصار کرنا ان کی فطرت میں نہیں تھا، اپنی دنیا آپ آباد کر و اسی کے وہ قائل تھے۔

ان کی زندگی کے بے شمار پہلو ہیں، ایک تو یہی ہے کہ وہ بے نظیر مقرر اور ممتاز ترین خطیب تھے ان کی تقریر اور خطابت کی مثال کبھی بپھرے ہوئے سمندر کی سی ہوتی، کبھی آندھی اور طوفان کی صورت میں ظاہر ہوتی، کبھی صحنِ چمن میں کھلتے اور مہکتے ان غنچوں کی جو پھول بنتے اور فضائے چمن کو اپنی خوشبو سے معطر کئے رکھتے، علمار اور عوام یکساں طور پر

ان کے زورِ خطابت کے قائل تھے، جو اہل علم تھے ان کا والہانہ پن تو کچھ اور ہی ہوتا تھا جو عوام تھے اور بات سمجھنا یا اس کی گہرائی تک پہنچنا جن کے لیے ممکن نہ تھا وہ بھی بلند آہنگ اور جداگانہ لب ولہجہ کی وجہ سے ہمہ تن گوش رہتے اور ان کی یہ کیفیت ہوتی۔

اس کے لہجہ میں قیامت کی فسوں کاری تھی
لوگ آواز کی لذت میں گرفتار ملے

دیوبند کی حد تک یہ کہنے میں مجھے کوئی تامّل نہیں ہے کہ یہاں ان کی سب سے زیادہ تقریریں سننے والا میرے سوا کوئی دوسرا نہیں ہے جب وہ جوان تھے شباب کی قوتیں اور جوانی کا جوش بھرپور تھا ان کی تقریر کی بلندی، روانی، بہاؤ، برق رفتاری کا کیا ٹھکانا تھا اتنا سحر اور ایسا جادو کہ شاہ صاحبؒ کی ہر تقریر کئی کئی روز تک ان ہی کے انداز میں دہرائی جاتی اور صرف طلبہ نہیں اہل شہر بھی ان کی نقل کرتے دکھائی دیتے، دیکھنے کا معاملہ تو ہے نہیں پڑھا یا پھر اپنے بڑوں اور اساتذہ سے سنا کہ شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانویؒ، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلویؒ کی شان، جامعیت اور زبان نے انظر شاہ کے قالب میں ڈھل کر ایک نیا اسلوب اور لہجہ اختیار کرلیا تھا جو ان اکابر کی یادیں بھی زندہ رکھتا تھا اور ان کے منفرد ہونے کا ثبوت بھی بنتا تھا، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی سی محبوبیت اور مرجعیت ان کو حاصل رہی اور خطابت کے میدان میں حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہ کے بعد وہ دیوبند کی خطابت کے امین قرار پائے جب وہ بولتے تو بجلیاں سی تڑپتیں، سورج اور چاند بھی کان لگا کر سنتے، ستاروں کی نگاہیں بھی ان ہی پر ٹکی رہتیں، بادِ صبا بھی ٹھہر کر چلتی اور شام کے سہانے مناظر بھی کچھ دیر کے لیے ان کے قدموں میں بیٹھنے کو اپنی خوش نصیبی تصور کرتے، الفاظ گویا صرف ان کے لیے بنے تھے یا

ان ہی کی حاکمیت کو قبول کرتے تھے بسا اوقات تو ایسا ہوتا کہ ان کی ادائیگی کے حسن میں گرفتار ہو کر لوگ اپنی جگہ ساکت کھڑے رہتے اور ان کی تقریر ختم ہونے کے کافی دیر بعد انہیں احساس ہوتا کہ شاہِ خطابت رخصت ہو چکا اور اب یہ رخصتی تو دائمی رخصتی میں تبدیل ہو چکی ہے اور وہ یہ کہتے ہوئے رخصت ہو گئے ہیں

میری آواز کو محفوظ کرلو ❁ کہ میرے بعد سناٹا بہت ہے

بلاشبہ دیوبند کی خطابت کا یہ آخری تاجدار نہایت وقار اور تمکنت کے ساتھ رختِ سفر باندھ چکا ہے مگر کیا ایسا ممکن ہے کہ ان کے چلے جانے سے وہ نقوش دھندلے ہو جائیں جو ان کی تقریر اور خطابت نے قائم کیے یا وہ یادیں سو جائیں جو ان کی زندگی سے وابستہ تھیں یادوں کے چراغوں کی لو مدھم تو ہو سکتی ہے بجھ نہیں سکتی۔

ان کی گھریلو زندگی پر چوں کہ دوسروں کے لیے لکھنا مشکل ہوگا مگر گھر کا فرد ہونے کی بنا پر اس پہلو پر میرے لیے بات کرنا آسان ہے اس لیے چند یادیں اور باتیں بھی اس سلسلہ کی پیش ہیں وہ نہایت نفیس ذوق کے مالک تھے اور نفاست کچھ اس طرح رچ بس گئی تھی کہ ان کی زندگی میں کہیں بھی یہ دیکھی جا سکتی ہے، اجلا لباس، اعلیٰ اور معیاری شیروانی، خوبصورت رومال، قیمتی چادر، بچھانے کے صاف ستھرا بستر، تکیہ نہایت نرم اور آرام دہ، نشست گاہ پرسکون، دسترخوان وسیع اور کشادہ، مہمانوں کی آؤ بھگت، مجلس میں آنے والوں کی بھی خوب خوب مدارات، اصرار کرتے رہتے اور کھانے کی تاکید کرتے رہتے، ہر موسم کے پھل خود بھی کھاتے اور دوسروں کو بھی کھلاتے، ہاں کھانے میں بے حد محتاط تھے گھر ہی میں نہیں امراء اور رؤسا کے دسترخوان پر بھی وہ ہی خوراک جس کے وہ عادی اور اتنی ہی مقدار جو انہوں نے اپنے لیے متعین کر رکھی تھی، ڈکاریں لے کر کھانا نیچے اتاریں اور پھر دو چار لقمے لیں یہ ممکن نہ تھا کپڑے روز تبدیل کرتے اور اس میں موسم کی تخصیص نہیں تھی۔

اپنے معمولات کے بے حد پابند تھے، ۶۰؍سال تو انہوں نے اپنے ایسے گذارے کہ تساہل اور سستی کو راہ نہ دی، صبح ٹہلنا، شام کو چہل قدمی کرنا، آندھی، طوفان، باد و باراں، گرمی کے تھپیڑے، برفانی ہوائیں، تیز بارشیں شاہ صاحبؒ کا معمول متأثر نہ ہوتا، تیزی کے ساتھ کئی کئی میل دور نکل جاتے، دیوبند میں ہوں یا ہندوستان کے کسی حصہ میں یا پھر دنیا کے کسی بھی ملک میں ان کی صبح وشام کی تفریح معمولاً جاری رہتی، مغرب بعد عموماً وہ لکھنے کے عادی تھے اور عرصۂ دراز سے لکھنے کے بجائے وہ اپنے مضامین، مقالات اور روز کی ڈاک کے جوابات املا کراتے، بہت بار مغرب کے بعد یہ خدمت انجام دینے کی سعادت مجھے بھی حاصل رہی، کبھی ایسا بھی ہوا کہ میں اپنی کتابوں پر کچھ لکھوانے کے لیے پہنچ گیا، انہیں موضوع بتایا اور انہوں نے فوراً کہا لکھو ایک ہی نشست میں طویل ترین تحریریں مکمل ہو جاتیں، اگر کسی جگہ انہیں یہ خیال گذرتا کہ لفظ سخت آگیا ہے اور میرے لیے اس کا لکھنا مشکل ہوگا فوراً املا کراتے اور ہر ہر حرف بتا کر فرماتے اس طرح لکھو، ان کے یہاں آمد غضب کی تھی ہر وقت ذہن حاضر تھا اور استحضار بلا کا تھا، اشعار کا برمحل استعمال ہوتا اور لاتعداد اشعار ان کے حافظہ میں موجود تھے، میں نے یہ پہلے بھی لکھا ہے اور اب پھر دہرا رہا ہوں اتنی پر شکوہ، جاذب نظر، دلکش، خوبصورت، حسین تحریر ان ہی کے ذریعہ ممکن تھی، تقریر کی طرح ان کی تحریر کا رنگ بھی جداگانہ اور منفرد تھا اور کوئی اس میدان میں ان کا شریک و سہیم نہ تھا۔

اہل خانہ کی ضروریات کی تکمیل اور ان کی آرزوؤں کو پورا کرنا ان کی عادت تھی، پہلی اہلیہ کے انتقال کے بعد تو جیسے انہوں نے طے کر لیا تھا کہ وہ کسی مرحلہ پر اپنے بچوں کو مایوس اور محروم نہ دیکھیں گے، بچوں کی مسکراہٹ اور شگفتہ چہرے ان کی زندگی تھے، ماں کی کمی کبھی محسوس نہیں ہونے دی ان کی محنت اور محبت کا محور بچے تھے، بلاشبہ انہوں نے ماں کی شفقت اور باپ کا بھرپور پیار انہیں دیا، ان کی اپنی کوئی خواہش نہ تھی

جو کچھ تھا وہ ماں کے سائے سے محروم ان بچوں کے لیے تھا، سب کے فرائض خوش اسلوبی سے ادا کئے بلکہ نہایت شان کے ساتھ ادا کیے اور دو سال پہلے اپنی سب سے چھوٹی بچی کے فرض سے بھی اپنے روایتی انداز میں فارغ ہوئے۔

سفر سے انہیں طبعی وحشت تھی اور بڑی مشکل سے وہ سفر پر آمادہ ہوتے تھے مگر جب ارادہ کر لیتے تو ایک ماہ سے زائد بھی باہر گذارتے، اندرون ملک لاتعداد سفر کئے اور بیرونی ممالک میں بھی ان کے بے شمار اسفار ہوئے، جہاں پہنچے ان کے چاہنے والوں نے انہیں پلکوں پر بٹھایا اور ان کی محبت وعقیدت سے لوگ سرشار نظر آئے، کشمیر سے طویل عرصہ تک کٹے رہنے کے بعد اپنے نامور والد کے علوم وکمالات کو کشمیر میں دوبارہ زندہ کیا اور سال میں کئی کئی بار کشمیر پہنچ کر ان رشتوں کو مضبوط کیا جو حضرت امام العصرؒ کی ذات اور نسبت سے تعلق رکھتے تھے، طویل زمانے تک مدراس، بنگلور، ممبئی ان کے خطابات کا مرکز تھے اور خصوصاً ماہ رمضان میں حدیث وتفسیر کا درس جاری رہا پھر ہندوستان کا کوئی صوبہ ایسا نہیں بچا جہاں ان کے دینی، علمی، تبلیغی سفر نہ ہوئے ہوں اب ایک زمانے سے وہ رمضان لندن میں گذار رہے تھے، گذشتہ رمضان دیوبند ہی میں رہے اور یہاں بھی بعد عصر حدیث اور بعد نماز تراویح تفسیر بیان فرماتے تھے جس میں اچھی خاصی تعداد طلبا، اور اہل شہر کی ہوتی۔

اپنے والد سے انہیں عشق تھا اور ان کے علوم ومعارف کی اشاعت کا جذبہ ہمیشہ شدید رہا، والد مرحوم مولانا سید ازہر شاہ قیصر کو بھی خداوند عالم نے یہ ہی جذبہ اور شوق دیا تھا شاہ صاحبؒ بھی اسی جذبے میں ڈوبے ہوئے تھے، چنانچہ جامعہ امام محمد انور قائم کر کے جہاں انہوں نے درس نظامی کا اعلیٰ اور معیاری نظم فرمایا وہیں حضرت امام العصرؒ کے افادات پر کافی کام کیا جو انشاء اللہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔

ان کی ۸۲؍سالہ زندگی کے ان گنت کارنامے اور واقعات ہیں، مگر ۴۲؍سال کی

زندگی کا ہر صفحہ میرے سامنے ہے ان کی سرگرمیاں، ان کی مصروفیات، ان کے معمولات، زندگی کے بے شمار گوشے، صبح وشام، رات اور دن کی جدوجہد، عزم وارادے کی پختگی، کاموں کو اپنے وقت میں انجام دینے کی تڑپ اور بے چینی، لوگوں سے ملاقاتیں، جلسوں اور پروگراموں میں شرکت، ان کی انفرادیت اور جامعیت کے ہزاروں مناظر، سب کچھ حقیقت ہیں مگر سب سے بڑی حقیقت موت نے ان کو تمام اختصاصات کے ساتھ ہم سے جدا کردیا، ۲۲ر سال پہلے جس یتیمی کا حملہ ہوا اس یتیمی نے ایک بار پھر اندھیروں میں دھکیل دیا، اور ان کے وجود مسعود کی گھنیری چھاؤں سے محرومی نے یہ باور کرادیا ہے۔

زندگی جس کا بڑا نام سنا جاتا ہے
ایک کمزور سی ہچکی کے سوا کچھ بھی نہیں

وہ رخصت ہوگئے مگر اس احساس کو ہمیشہ کے لیے زندہ کرگئے

زندگی شمع کی مانند جلاتا ہوں ندیم
بجھ تو جاؤں گا مگر صبح نو کرجاؤں گا

خداوند عالم انہیں غریق رحمت فرمائے، ان کو کروٹ کروٹ چین نصیب فرمائے، ان کے درجات بلند فرمائے اہل خانہ اور خاندان کے تمام افراد کو صبر جمیل کی دولت سے نوازے۔ (آمین)

❀ ❀ ❀

حضرت شاہ صاحبؒ کی مجلسیں

شاہ صاحبؒ کی زندگی پر نظر ڈالنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ آپ کی زندگی کا ہر گوشہ نکھرا ہوا تھا اور ان کے یہاں استفادے کے دروازے ہمیشہ کھلے ہوئے تھے ان کی ایک ایک ادا اور انداز سے اخلاق اور عمل کو تقویت حاصل ہوتی تھی انکی زبان سے نکلا ہوا جملہ یا ایک لفظ بھی بے معنی نہیں ہوتا تھا ان کی عشار کی نماز کے بعد کی مجلس کا حال جن لوگوں کے زیر قلم آیا ہے انھوں نے بلا تکلف یہ بات لکھی ہے کہ اتنی جاذب، شگفتہ اور شاداب مجلس ہمارے بڑوں میں کسی کے یہاں نہیں رہی شاہ صاحبؒ کا حافظہ، غضب کی یادداشت اور مطالعہ کی وسعت اس مجلس میں کچھ اور ہی رنگ لئے ہوتی شاہ صاحبؒ کی مجلس کا ہر حاضر کسی تامل کے بغیر اپنی بات کہہ سکتا تھا بلکہ اپنی رائے کا اظہار کرنے اور ہمہ دانی کے دعوے سے بھی نہیں چوکتا تھا اور وہ پوری توجہ کے ساتھ اس کی بات سنا کرتے تھے علمی نکتہ آفریناں ہوتیں، تاریخ کے صفحات کھولے جانے، اکابر کا تذکرہ ہوتا، علوم قرآنیہ پر گفتگو ہوتی، احادیث کی تشریح اور مراد پر کلام کیا جاتا، ملکی اور بین الاقوامی سیاست پر تبصرہ فرماتے غرض کہ ان کی یہ مجلسیں مختلف علوم اور معلومات کا خزانہ تھیں اور ان گوشوں تک رسائی ہوتی تھی جو عموماً آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہیں عوام وخاص سبھی ان کے یہاں سے کچھ نہ کچھ حاصل کر کے اٹھتے تھے ان کی مجلسوں کا ایک فائدہ تو میں نے یہ دیکھا اساتذہ وہ سوالات کرتے جن کے جوابات سے یا تو واقف نہ تھے یا ان کے ذہنوں میں جوابات واضح نہیں ہوتے تھے پھر خود شاہ صاحبؒ کی زبان پر ایسے علمی نکتے آتے جو اساتذہ کے لئے بیحد کار آمد ہوتے، واقعات کا تسلسل اور پیرایۂ بیان اتنا دلچسپ ہوتا تھا کہ سامعین ہمہ تن گوش رہتے عام

آدمی کی رعایت بھی ہوتی اور ان کو مخاطب بنا کر وہ قصے چھیڑتے جو نصیحت آموز ہونے کے ساتھ انتہائی آسان اور سہل ہوں ان کی مجلسوں کے رنگ بدلتے رہتے تھے اس کو سمجھنے کے لئے چند مجلسوں کا رنگ دیکھئے:

مولانا رومؒ کی معنی خیز تمثیلات

فرمایا مولانا رومؒ جہاں اسرار و رموزِ معرفت کے بیان میں منفرد ہیں، وہیں ان کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ تمثیل بہت ہی معنی خیز اور برمحل لاتے ہیں۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت شاہ صاحب نے تواضع سے متعلق مثنوی کا ایک شعر سنایا جس کا مفہوم یہ ہے کہ متواضع ہمیشہ کامیاب و سرخ رو رہتا ہے۔ جب کہ متکبر رسوا اور ناکام۔ اس کی مثال یہ ہے کہ جب تیز ہوا اور طوفان آتا ہے تو بڑے اور اونچے درخت تو گر جاتے ہیں، مگر سبزہ اور گھاس جو لوگوں کے پیروں سے روندا جاتا ہے، پہلے سے بھی زیادہ صاف ہو کر نکھرتا ہے۔ (خیر المجالس/ص:۲۹)

''اللہ،، اسم ذات اور اعرف المعارف ہے

فرمایا شیخ اکبر محی الدین العربیؒ فرماتے ہیں کہ لفظ ''اللہ،، ہی اسم اعظم ہے اور یہی اعرف المعارف بھی ہے حالاں کہ بعض نحاۃ نے ضمیر مخاطب ''انت،، کو اور بعض نے ضمیر متکلم ''انا،، کو اعرف المعارف بتایا ہے، مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ اس کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ نے ان دونوں اقوال کی وجوہِ تغلیط مختصراً ذکر کیں۔ فرمایا کہ ''اللہ،، ہی اعرف المعارف ہے اور شیخ اکبر کی بات بالکل درست ہے۔ (خیر المجالس :ص:۳۰)

ہر مخلوق اپنے انداز میں محوِ تسبیح

فرمایا کہ حدیث میں آتا ہے کہ سورج روزانہ عرش الٰہی کے سامنے سجدہ ریز ہوتا ہے،

جب کہ سورج ہمہ وقت گردش میں رہتا ہے، کبھی رکتا نہیں تو سجدہ کب کرتا ہے؟ پھر سورج آسمان دنیا پر ہے اور عرشِ الہی سات آسمانوں کے بعد، تو سورج عرش کے سامنے کس طرح پہنچتا ہے؟

اس پر بھائی احمد خضر صاحب (صاحبزادہ حضرت شاہ صاحب) نے مولانا محترم سے معلوم کیا کہ عرش کہاں ہے؟ تو مولانا نے کہا کائنات پر محیط ہے۔ اس پر کہنے لگے کہ پھر آپ کا اشکال ہی ختم ہو گیا، اس لئے جب عرش تمام کائنات کو محیط ہے تو جہاں بھی سورج سجدہ کرے، وہ عرش کے سامنے ہی ہوگا۔ رہی بات گردش مسلسل کی، تو ہر ایک کی عبادت، تسبیح اور سجدہ کا انداز الگ ہے۔ کیا ضروری ہے کہ سورج بھی ہم انسانوں کی طرح سجدہ کرے اور اس کے لئے اسے رکنا پڑے۔ حضرت شاہ صاحب اس جواب پر خاموش رہے گویا اس کی تصویب فرمائی۔ (خیر المجالس ص ۲۳)

علامہ کشمیریؒ اور استاذ کا احترام

دوسری طرف اساتذہ کے ادب واحترام کا یہ عالم تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ استاذ تھے اور الکشمیریؒ ان کے شاگرد، لیکن مجلس میں بھی اباجی سے فرماتے کہ شاہ صاحب! میرے ذہن میں یہ بات آتی ہے، آپ کی نظر سے بھی کہیں گذری؟ اباجی عموماً بتادیا کرتے تو فرماتے اب تو میں اسے پورے وثوق واطمینان کے ساتھ بیان کروں گا۔ پھر بھی الکشمیری کے غایت ادب کا یہ عالم تھا کہ جب بھی حضرت شیخ الہند کے سامنے پڑتے سر جھکا لیا کرتے تھے۔

یہ بھی یاد رکھئے کہ اباجی نے اپنے استاذ حضرت شیخ الہندؒ کا اس حد تک پاس ادب ملحوظ رکھا کہ کبھی حضرت شیخ الہند کے مکان کی طرف پاؤں کر کے نہ سوئے۔

اولئك آبائی فجئنی بمثلهم ☆ إذا جمعتنا یا جریر المجامع

(خیر المجالس: ص: ۳۹)

جدید سائنس اسلام کی خادم ہے

’’فرمایا ایک دفعہ ابا جی (علامہ کشمیریؒ) بھوپال تشریف لے گئے۔ وہاں جدید تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ مختلف مسائل پر استفادہ واستفسار کی غرض سے خدمت میں حاضر ہوا، بالخصوص یہ بات معلوم کی کہ فلسفہ قدیم اور سائنس جدید میں سے کون سا اقرب الی الاسلام ہے؟ تو فرمایا کہ اگر کسی شخص کی نظر کائنات میں پھیلی ہوئی اللہ تعالیٰ کی کرشمہ سازیوں اور جدید سائنس کی تحقیقات اور انکشافات پر یکساں ہو اور اس کا سینہ علوم کتاب وسنت سے بھی منور ہو، تو اس کے لیے یہ بات سمجھنا دشوار نہ ہوگی کہ جدید سائنس نہ صرف یہ کہ اسلام مخالف نہیں بلکہ اس کی خادم اور اس کی بہت سی حقیقتوں کی حامی اور مؤید ہے‘‘۔ (خیر المجالس: ص:۴۱)

بادشاہِ وقت کے سامنے شاہ شہید کی حق گوئی

فرمایا حضرت مولانا اسماعیل شہید دہلویؒ ایک روز جامع مسجد دہلی کے حوض پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اسی وقت تبرکات قلعہ کو جارہے تھے۔ یہ تبرکات ہر سال ایک بار بادشاہ کے پاس جایا کرتے تھے۔ حکم یہ تھا کہ اس وقت کوئی شخص بیٹھا نہیں رہ سکتا تھا، اس کو تعظیماً کھڑا ہونا ضروری تھا۔ لیکن حضرت مولانا بیٹھے رہے، بادشاہ سے شکایت کی گئی کہ اسماعیل ایسا گستاخ ہوگیا ہے اب حضور اکرم ﷺ کے تبرکات کی بھی زیارت نہیں کرتا اور نہ ان کی تعظیم کرتا ہے۔ بادشاہ چوں کہ اس خاندان کی عزت کرتا تھا، اس لئے مولانا کی دعوت کی اور کھانے کے وقت کہا کہ بعض لوگ آپ کی بدخواہی کرتے ہیں اور مجھ کو غلط خبریں پہنچاتے ہیں اور دوران گفتگو کہا کہ سنا ہے آپ تبرکات کی تعظیم بھی نہیں کرتے؟ حضرت مولانا نے فرمایا نہیں جس نے شکایت کی ہے وہ میرا بدخواہ نہیں، بلکہ

میرا خیر خواہ ہے، اس نے یہی بات آپ تک پہنچائی ہے۔ میں تو خود چاہتا تھا کہ آپ کو یہ بات پہنچ جائے۔ بادشاہ کو اس پر غصہ آ گیا اور کہا کہ آپ ایسے جری ہو گئے ہیں کہ اب تبرکات کی بھی تعظیم نہیں کرتے؟ مولانا نے فرمایا بے شک جو حضور اکرم ﷺ کا تبرک ہو، وہ ہزاروں جان سے تعظیم کے لائق ہے لیکن جو تبرک ہی نہ ہو، ہم اس کی تعظیم نہیں کرتے۔ بادشاہ نے کہا کیا آپ ان کو تبرک نہیں سمجھتے فرمایا جی نہیں! اور میں کیا خود آپ بھی نہیں سمجھتے کہ اگر یہ واقعی تبرک ہوتے تو آپ ان کی زیارت کو جاتے یا وہ خود آپ کے پاس آتے؟

اس پر بادشاہ نے کہا کہ آپ نے سچ کہا اور اس نے مولانا کی تعظیم کی۔ پھر مولانا نے بادشاہ سے فرمایا کہ آپ سونے کا کنگن پہنے ہوئے ہیں، یہ شرعاً حرام ہے۔ بادشاہ نے فوراً اتار کر مولانا کی نذر کر دیا۔ مولانا نے فرمایا میں ہرگز نہ لوں گا۔ بادشاہ نے کہا اچھا! خیرات کر دینا، فرمایا آپ خود کریں، میں لیکر نکلا تو لوگ کہیں گے کہ کنگن لے کر آ گئے، حق بات نہیں کہی۔ (خیر المجالس ص ۶۲/۶۳)

وحی کی شدت

فرمایا کہ وحی ہے تو غیر مرئی اور لطیف شئی، لیکن ثقیل کتنی ہوتی ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اولاً حضور اکرم ﷺ خود سلیم الفطرت، گناہوں ہی سے بچپن ہی سے دور و نفور، پھر جواں عمری میں غار حرا میں جا کر ذکر و اذکار، مراقبہ و تزکیۂ باطن، مزید برآں جبرئیل امین کے ذریعہ تین بار قلب مبارک کو شق کر کے کوثر و تسنیم سے اس کی تطہیر، ہر قسم کے رذائل کا ازالہ، نور معرفت اور روحانی قوت کی فراوانی، بعد ازاں نبوت و رسالت، اس کے لئے مطلوبہ قوت و طاقت: بہ ایں ہمہ نزول وحی کے وقت شدتِ ثقل سے آپ کی وہ کیفیت ہوتی تھی، جو اوپر مذکور ہوئی۔

فرمایا حضرت عیسیٰ و حضرت آدم علیہما الصلوۃ والسلام پر کل دس دس مرتبہ وحی نازل ہوئی، سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام پر پچاس مرتبہ اور آدم ثانی حضرت نوح علیہ السلام پر اڑتا لیس بار، مگر حضور اکرم ﷺ پر چوبیس ہزار مرتبہ وحی کا نزول ہوا۔ اندازہ لگایئے کہ حضور ﷺ کو کس قدر شدید تکلیف سے گذرنا پڑا ہوگا۔ کیا یہ بات عقل میں آسکتی ہے کہ کوئی شخص محض اس موہوم امید پر کہ لوگ اس کے پیروکار بن جائیں، چوبیس ہزار بار ایسی شدید تکالیف سے خود کو دوچار کرسکتا ہے؟ (خیر المجالس/ص ۴۳۔۴۷)

علامہ عثمانیؒ نے علومِ کشمیری سب سے زیادہ اخذ کیے

فرمایا کہ حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ کو ملکی سیاست حاضرہ سے بھی بڑی دلچسپی تھی اور علم و فضل میں بھی مقام بلند پر فائز تھے۔ مولانا بنوریؒ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت الاستاذ العلامہ کشمیری کے علوم و معارف سے سب سے زیادہ اکتساب علامہ عثمانی ہی نے کیا ہے۔ بالخصوص زمانہ ڈابھیل میں۔ چناں چہ "فتح الملہم" میں حضرت علامہ کے حوالے سے ان کی آرا جابجا بیان کرتے ہیں۔ (خیر المجالس: ص: ۱۱۷-۱۱۸)

حضرت! یہ انٹرویو ہے، وعظ نہیں

فرمایا حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ حدیث نبوی "المؤمن غر کریم" کا صحیح مصداق تھے۔ کوثر نیازی جو ممتاز صحافی تھے اور بعد میں پاکستان کی وفاقی حکومت میں وزیر بھی ہوئے، مولانا کاندھلویؒ کے شاگرد تھے۔ ایک دفعہ مولانا کاندھلویؒ کے پاس ان سے انٹرویو لینے آئے اور متعلقہ بحث کی بابت مولانا سے سوال کیا مولانا نے تسمیہ پڑھ کر خطبہ مسنونہ پڑھنا شروع کردیا اس پر کوثر نیازی نے عرض کیا کہ حضرت! یہ انٹرویو ہے، تقریر کا موقع نہیں ہے۔ فرمایا کچھ بھی ہو، ہم تو خطبہ مسنونہ کے بعد ہی

کوئی بات کہیں گے۔ (خیر المجالس:ص:۱۱۸-۱۱۹)

سورۂ ضحیٰ کی دل نشیں تشریح

کچھ عرصے کیلئے وحی رک جانے پر کفار و مشرکین یہ طعنہ دینے لگے تھے کہ میاں! محمد جس خدا کی بات کیا کرتے تھے اور جس کی جانب منسوب کر کے باتیں سنایا کرتے تھے۔ آج کل وہ خدا اس سے ناراض ہو گیا ہے، محمد کو یکا و تنہا بے یار و مددگار چھوڑ دیا ہے۔ از راہ تقاضائے بشریت یہ فقرے حضور اکرم ﷺ کو بے حد گراں گزرتے۔ جب طعن و تشنیع حد سے بڑھ گئی تو حق تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرما کر حضور ﷺ کی دل بستگی کی۔ ابتدار ہی میں فرمایا ''والضحیٰ و اللیل إذا سجیٰ'' ''ضحی،، ٹھیک دوپہر کی روشنی کو کہا جاتا ہے، جب ذرہ ذرہ روشن ہو جاتا ہے۔ پھر رات کی قسم کھائی اور اس کی تاریکی کو مزید مؤکد کرنے کیلئے ''اذا سجیٰ،، فرمایا۔ دراصل اس سے اشارہ اس امر کی جانب مقصود تھا کہ نشیب و فراز، تنگی و سہولت، پریشانی و آسانی اور حالات میں مدو جزر تو ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ روزانہ مشاہدہ ہے کہ ابھی انتہائی روشنی تھی، ایک ایک ذرہ کائنات کا چمک رہا تھا اور نظر آ رہا تھا اور ابھی چند گھنٹوں میں ایسی تاریکی چھا گئی کہ اپنا ہاتھ بھی دکھائی نہیں دیتا، اس لئے انقطاع وحی اور اتصال وحی بھی اسی قبیل کی چیز ہے، اس سے دل برداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں اور جہاں تک معاندین کے دل آزار فقروں کا تعلق ہے تو ''وما ودّعک ربُّک وما قلیٰ،، حقیقت یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے نہ تو آپ کو چھوڑا اور نہ ہی وہ آپ سے ناراض ہے۔

حق تعالیٰ نے مزید تسلی دیتے ہوئے اور اپنے نبی سے ناراضگی کے امکان کو مسترد کرتے ہوئے اس وقت کی یاد دہانی کرائی جب آپ ابھی منصب نبوت سے سرفراز نہ ہوئے تھے اور جو شانِ عظمت، نبوت و رسالت کے سبب، آپ کے حصے میں

آتی، اس سے بہرور نہ ہوئے تھے، لیکن دیکھیں کہ اس وقت بھی اللہ تعالیٰ کا آپ کے ساتھ کیا اور کیسا معاملہ رہا؟ فرمایا ''الم یجدک یتیماً فآوی'' آپ یتیم تھے، سایۂ پدر سے اس دنیائے فانی میں آنے سے پہلے ہی محروم ہو گئے تھے اور کم سنی ہی میں شفقت مادر بھی جاتی رہی۔ پھر اسی مرحلے پر دادا کی مفارقت کا غم آن پڑا، جو آپ کو اپنی جان سے بھی عزیز رکھتا تھا، مگر ہم نے آپ کو یتیموں کی سی بیچارگی، محرومی، مایوسی، بے بسی اور بے کسی کا شکار نہ بننے دیا، آپ کی دیکھ بھال، کفالت و پرورش، تحفظ و دفاع کیلئے آپ کے چچا کو کھڑا کر دیا، خاندان کو اس کام کے لیے کمربستہ بنا دیا۔ جنہوں نے شعب ابی طالب کے طویل زمانہ مقاطعت ومحاصرت میں بھی آپ کو اکیلا نہ چھوڑا۔ پھر فرمایا ''ووجدکَ ضالاً فھدٰی'' آپ جو اپنی قوم کی تباہی و بربادی، گمراہی و کج روی سے پریشان، بے تاب اور بے چین رہا کرتے، ان کی اصلاح کا غم آپ پر چھایا رہتا، اسی تشویش میں مبتلا رہا کرتے تھے، اسی بوجھ تلے دبے رہا کرتے تھے، مگر آپ کے پاس ان کی اصلاح کا کوئی واضح نقشہ نہ تھا، کوئی راستہ آپ کو نظر نہ آرہا تھا، ہم نے آپ کی بیتابی دور کی، بارغم ہلکا کیا، اصلاح قوم کا مکمل نقشہ بتا دیا اور اصلاح وفلاح کی راہ دو اور دو چار کی طرح آشکارا کر دی۔ مزید برآں یہ کہ ''ووجدک عائلاً فاغنی'' مالی پریشانی سے آپ دوچار تھے، تنگ معاشی کے آپ شکار تھے ہم نے مکہ کی ایک متمول اور نیک سیرت خاتون سے آپ کا نکاح کرا دیا، جنہوں نے اپنا کل مال واسباب آپ پر نثار وقربان کر دیا، اس کی بابت آپ کو کلی اختیار بھی دے دیا اور اس طرح آپ کی یہ پریشانی اور تشویش بھی جاتی رہی۔ ذرا سوچیے کہ جب رب کائنات نے قبل از بعثت آپ کو بے سہارا نہ چھوڑا، آپ سے ناراض نہ رہا اور آپ کی پریشانی کا علاج فراہم کیا، تو اب جب کہ اس نے آپ کو معراج انسانیت پر پہنچایا، نبوت ورسالت نہیں بلکہ ختم رسالت کے انفرادی وامتیازی اعزاز سے شرف یاب بنایا،

کیا وہ آپ کو بے یار و مددگار چھوڑ سکتا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں! یہ تو گردش زمانہ ہے، کبھی نرمی کبھی سختی اور کبھی تاریکی کبھی روشنی۔ یہ نظام کائنات ہے حالات کے نشیب وفراز سے آپ دل برداشتہ آزردہ خاطر نہ ہوں۔

آگے آپ کو بشارت آمیز ہدایت دی کہ آپ کو حق تعالیٰ کی جانب سے یہ حیثیت بھی عطا کی جانے والی ہے کہ آپ بے سہاروں کیلئے مضبوط سہارا بن سکیں، یتیموں اور بیکسوں کے والی بن سکیں اور دست طلب دراز کرنے والوں کی مرادیں پوری کرسکیں۔ اس لئے پہلے ہی یہ ہدایت دی جاتی ہے کہ آپ کسی یتیم پر سختی نہ کریں اور نہ ہی کسی سائل کو ڈانٹیں اور جھڑکیں بلکہ حق تعالیٰ نے آپ کے اوپر بچپن سے ہی نوع بہ نوع انعامات کی بارش کر رکھی ہے، جس میں نعمت کبریٰ رسالت و نبوت سب سے سرفراز ہے، اسے بیان کرتے رہئے۔ (خیر المجالس/ص: ۱۲۱-۱۲۲-۱۲۳)

حرمتِ مسلم حرمتِ مکہ سے زیادہ ہے

فرمایا بہت سی احادیث میں آپ ﷺ نے اہل ایمان کی جان کو سب سے زیادہ قیمتی قرار دیا ہے، چنانچہ ایک موقع پر آپ ﷺ بیت اللہ کے سامنے کھڑے ہیں فرمایا ''اے بیت معظم! تیری عزت و حرمت خدا کے یہاں اور ہمارے قلوب میں بے انتہا ہے مگر ایک مسلمان کی حرمت وعزت خدا کے یہاں تجھ سے زیادہ ہے'' قرآن کریم نے ان تمام مضامین کو اپنے معجز بیان میں ''اَشدّا ء علی الکفار رحماء بینھَم'' سے واضح کیا۔ قرآن وحدیث کی ان ہدایات کے بعد مسلمان اپنے کردار اور معاشرے کا جائزہ لیں کہ کیا ہماری زندگی، ہمارا عمل قرآن وحدیث کی ان واضح ہدایات کے مطابق ہیں۔

(خیر المجالس/ص ۱۳۰-۱۳۱)

قیام لیلۃ القدر سے مراد

فرمایا حدیث میں لیلۃ القدر کے ساتھ قیام کا لفظ استعمال ہوا ہے، اس پر اباجی کہتے ہیں

کہ متردد ہوں کہ آیا یہ قیام فی الصلوٰۃ کے معنی میں ہے، یا قیام نوم کے مقابل ہے؟ اگر قیام للصلوۃ کے معنی میں ہے تو مطلب یہ ہوگا کہ جو لیلۃ القدر میں نماز کا اہتمام کرے اسے یہ اجر ملے گا، اور اگر یہ قیام مذکور دوسرے معنی میں ہے تو پھر مطلب یہ ہوگا کہ جس نے لیلۃ القدر کا احیار کیا خواہ نماز پڑھتا رہا، یا دوسرے اذکار میں مشغول رہا، سویا نہیں وہ اس اجر کا مستحق ہوگا، جیسا کہ وقوف عرفہ میں قیام ضروری نہیں، ہاں مستحب ضرور ہے، فرمایا کہ اباجی کہتے ہیں کہ ایسا ہی تردّد مجھ کو "قم اللیل الا قلیلا"، میں ہے کہ تہجد مراد ہے یا صرف احیار لیل؟ مفسرین قیام سے صلوٰۃ مراد لیتے ہیں، جس میں قرأت مطلوب ہے، جیسا کہ "ورتل القرآن ترتیلاً"، سے واضح ہے، اور اگر مطلق قیام پیش نظر ہے، تو مقصود قرآن کی تلاوت ہے خواہ نماز میں ہو یا خارجِ نماز۔ (خیر المجالس: ص: ۱۳۸-۱۳۹)

قرآنی محاورات و تعبیرات

"فرمایا قرآن نے ایک موقعہ پر ارشاد فرمایا ہے "فَاَذَاقَهُمُ اللّٰه لباس الجوع والخوف"، اس آیت کی تفسیر میں علمائے تفسیر کو بڑے اشکالات پیش آئے ہیں کہ لباس ملبوسات میں سے ہے: نہ کہ مذوقات میں سے پھر خدا تعالیٰ نے اسے مذوقات یعنی چکھی جانے والی چیزوں میں کیسے شمار کیا؟ کوئی اسکا شافی جواب نہ دے سکا، اباجی فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے "کشکول"، میں اسکا جواب دیا ہے، تفصیل تو وہیں ملے گی لیکن مختصر یہ کہ میں اسے بھی محارات و تعبیرات میں سے سمجھتا ہوں"، (خیر المجالس / ص ۱۴۸)

اقوام متحدہ امریکا کی کنیز

فرمایا امریکہ نے فوجی جارحیت کیلئے اقوام متحدہ اور سلامتی کونسل کی بھی اجازت ضروری نہ سمجھی، حالانکہ اقوام متحدہ کی حقیقت ہی کیا ہے امریکہ کی داشتہ سے زیادہ کچھ نہیں، لیکن

امریکہ اس قدیم کنیز سے اپنا دامن جھٹک چکا ہے، اقوام متحدہ کا وجود انہی اسلام دشمن طاقتوں کا رہین منت ہے اب سے کوئی پچاس پچپن سال پہلے اسکا قیام عمل میں آیا، اور مقصد یہ تھا کہ دنیا سے جنگ وجدال کا خاتمہ ہو اور امن وآشتی کی باد بہاری چلے۔

لیکن حقیقت اسکے برعکس ہے، گذشتہ پچپن سال میں چھوٹی بڑی دوسو پچیس سے زیادہ جنگیں ہوئیں، جن میں ۲/ کروڑ سے زیادہ لوگ ہلاک ہوئے، اوران میں سے (۹۰٪) نوے فیصد بے قصور عوام، معصوم بچوں اور خواتین کی تعداد تھی۔ (خیر المجالس/ص ۱۵۳)

حضور اکرم ﷺ کا چہرۂ انور

حضور اکرم ﷺ کی سیرت وشخصیت پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ حضرت صحابہ کرام کا بیان ہے کہ ایک شب ہم مسجد نبوی میں حاضر تھے حضور اکرم ﷺ بھی تشریف فرما تھے۔ چاندنی کھلی ہوئی تھی، ہم کبھی آپ ﷺ کے چہرۂ انور کو دیکھتے اور کبھی چاند کو، ہم نے دیکھا کہ چہرۂ انور کا نور چاند سے بھی بڑھا ہوا تھا، اس وقت حضور اکرام ﷺ سرخ یمنی چادر زیب تن کیے ہوئے تھے۔ (خیر المجالس/ص ۱۶۲)

حضور اکرم ﷺ کا پسینہ

فرمایا حضرت ام سلمہؓ کا بیان ہے کہ جب حضور اکرم ﷺ کے جسم اطہر سے پسینہ نکلتا تو ہم اسے جمع کرلیا کرتے، خدا کی قسم! جو خوشبو آپ ﷺ کے پسینے میں تھی، وہ مشک وعنبر میں بھی نہ ہوتی تھی۔ (خیر المجالس/ص ۱۶۲)

حدیث انما الاعمال کی شان ورود

فرمایا حدیث ''الاعمال بالنیۃ،، جیسا کہ سبھی کو معلوم ہے، نہایت اہم حدیث ہے،

آج کی مجلس میں حدیث ہذا کے صرف ایک پہلو پر مختصراً عرض کرتا ہوں، وہ یہ ہے کہ اس حدیث کا آخری جملہ ہے۔

(۱)عن عمران رسول اللّٰہ قال: الاعمال بالنیات ولکل امری مانوی فمن کانت ھجرتہ الی اللّٰہ ورسولہ فھجرتہ الی اللہ ورسولہٖ ومن کانت ھجرتہ الی دنیا یصیبھا اوامراۃ یتزوجھا فھجرتہ الی ماھاجر الیہ (بخاری شریف:۱/۱۲)

ترجمہ: حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اعمال کا مدار نیتوں پر ہے اور ہر شخص کے لئے وہی ہے جسکی اس نے نیت کی لہذا جس شخص کی ہجرت اللہ اور اسکے رسول کیلئے ہے تو اسکی ہجرت اللہ اور اسکے رسول کیلئے ہے، اور جس شخص کی ہجرت حصول دنیا کیلئے یا کسی عورت سے شادی کرنے کیلئے ہے، تو اسکی ہجرت اسی چیز کیلئے ہوگی، جس کیلئے اس نے ہجرت کی۔

فرمایا اس جزو کا ایک خاص پس منظر ہے ایک صاحب مکہ مکرمہ میں تھے جو ایک خاتون سے شادی کرنا چاہتے تھے، اس خاتون نے نکاح کرنا تو منظور کرلیا مگر یہ شرط لگادی کہ تمھیں مدینہ منورہ سے ہجرت کر کے جانا ہوگا تبھی نکاح کرسکتی ہوں، چناں چہ ان صاحب نے مکہ مکرمہ سے مدینہ ہجرت کی اور مقصد یہ تھا کہ اس خاتون سے نکاح ہوجائے (خیر المجالس:۱۶۶)

مفتیانِ کرام کا بورڈ تشکیل دیے جانے کی ضرورت

آج کل بعض مفتیانِ کرام کی جانب سے غیر ضروری طور پر اور بغیر آپسی صلاح ومشورہ کے فتاویٰ صادر کیے جانے پر اظہار افسوس کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ ایک المناک اور افسوس ناک صورت حال ہے نئے حالات نئے مسائل اور نئے معاملات کی حقیقت، حیثیت اور ان کی گہرائی میں جائے بغیر نیز ان سے مکمل واقفیت کے بغیر

ہی لوگ فتاویٰ جاری کردیتے ہیں، جب کہ ہونا یہ چاہیے کہ اس قسم کے معاملات میں ماہرین فقہ وفتاویٰ کا ایک بورڈ تشکیل دیا جائے جس میں کسی بھی قسم کی جانب داری کے بغیر، باصلاحیت اور تجربہ کار مفتیان کرام کو شامل کیا جائے اور بورڈ جو فیصلہ صادر کرے اسے تسلیم کیا جائے۔ (خیر المجالس: ۱۸۰-۱۸۱)

حضرت شاہ صاحبؒ کی مجالس پر مشتمل مجموعہ ''خیر المجالس'' کے نام سے منظر عام پر آچکا ہے اس کتاب کا اگر آپ مطالعہ کریں تو یہ بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ یہ مجلسیں دینی اور دنیاوی معلومات سے خالی نہیں تھیں اور شاہ صاحبؒ کی زبان سے وہ علمی نکتے سامنے آتے تھے جن کی تلاش اور جستجو میں بے شمار کتابوں کی ورق گردانی کرنی پڑتی ہے مطالعہ اور محنت کے بغیر ان کا حصول ناممکن ہے۔

شاہ صاحبؒ کے اس دنیا سے پردہ کرنے کے بعد یہ مجلس بھی ماضی کا حصہ بن گئی ہے لیکن ہمیشہ ان کی مجلسوں کے تذکرے ہوتے رہیں گے۔

❋ ❋ ❋

عکسِ انور

وہ جس کے سینہ میں علمِ انور، وہ جس کے ہونٹوں پہ ذکرِ انور
وہ شیخ انور کا عکسِ انور ، وہ شیخ انظر بھی چل دیا ہے

جس شخص کی زندگی کا آغاز جوانی سے لے کر انتقال کے وقت تک بخوبی مشاہدہ کیا ہو جسکی ہر ادا اور ہر انداز کو قریب سے دیکھا ہو اور ہر دم گذرتے دنوں کی ہزاروں یادیں ذہن میں محفوظ ہوں اس کا ذکر جب نوک قلم پر آئے تو ترتیب باقی رکھنا اور ایک خاص اسلوب میں ان سب چیزوں کو بیان کر دینا ممکن نہیں ہے کبھی جوانی کے نقوش سر ابھارتے ہیں، کبھی جد و جہد اور بھاگ دوڑ کے مناظر سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں کبھی بڑھاپے کے وقار تمکنت اور مرجعیت کی تصویریں حافظہ کی قید سے کاغذ کے سینے پر اپنی جگہ بنا لینے کے لئے بے چین ہوں، تو ایسے وقت میں یہ مشکل ہو جاتی ہے کہ کس پہلو کا انتخاب کیا جائے اور کس گوشے کو چھوڑا جائے ہر سمت سے یہ صدا آتی ہے میں مقدم ہوں، ہر سو یہی آواز گونجتی ہے دیکھو مجھے نظر انداز کر کے آگے نہ بڑھ جانا۔

عمِ محترم حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب طاب اللہ ثراہ موت کی نیند سو گئے اور اس حقیقت کو جھٹلانا کسی طرح بھی ممکن نہیں مگر یہ ہوا کیسے ذہن اس کو قبول نہیں کرتا حالانکہ موت جیسا مرحلہ اس دنیا میں کوئی دوسرا نہیں جس سے کسی کو نجات ہو یا موت سے کسی کو رعایت حاصل ہو گئی ہو، یہ آئیگی اور پوری قوت کے ساتھ آئیگی، نہ کوئی بچا اور نہ کوئی بچ سکے گا؛ مگر شاہ صاحب ”جس طرح چلتے تھے۔ جس طرح دوڑتے تھے اور بقول حضرت مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی مدظلہ ہرن کی طرح چوکڑیاں بھرتے تھے۔ ۸۲/ سال کی عمر میں جو چستی، پھرتی اور مستعدی ان میں تھی اس سے قطعی یہ نہیں لگتا تھا کہ

صرف ۶ / ماہ میں تمام قوتیں سکڑ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن جائیں گی اور مثالی صحت کے مالک شاہ صاحبؒ زندگی سے دور ہوتے چلے جائینگے۔ ان کے بارے میں قطعی یہ خیال نہیں پیدا ہوتا تھا کہ ان کی عمر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے اور بہت جلد وہ رختِ سفر باندھ کر سب کو غم زدہ کرتے ہوئے اپنے خالق کی رحمتوں کے سائے میں ٹھکانہ بنالیں گے۔

یہ ذکر اس زمانے کا ذکر ہے کہ جب وہ دادی مرحومہ (اہلیہ امام العصر علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ) اور اپنے برادر بزرگوار مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر مرحوم کے ساتھ شاہ منزل محلّہ خانقاہ دیوبند میں رہتے تھے، یہ وہ مکان ہے جس میں ان کے نامور والد نے کافی سال گذارے اور زندگی کی آخری سانس لی، یہی مکان طویل ترین عرصہ تک علماء، فضلاء، زعماء، شعراء، ادباء اور بڑے شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ کے ارشد تلامذہ کا مسکن رہا تشنگانِ علم آتے اور علم کے بحر ناپیدا کنار سے سیرابی حاصل کرتے امیر شریعت حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مفکر ہند مولانا عبید اللہ سندھیؒ، رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ، مجاہدِ ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحبؒ، حضرت مولانا سیّد اصغر حسین میاں صاحبؒ، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ، حضرت مولانا ادریس صاحب کاندھلویؒ، حضرت مولانا سید محمد میاں صاحبؒ وغیرہ علمائے دھر کی آمد ورفت رہتی۔

میں نے حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب کو زندگی کی جس منزل میں دیکھا وہ میرے بچپن کی منزل تھی اور ان کے بھرپور شباب کا زمانہ، دارالعلوم دیوبند میں ان کی تدریس کے بھی شائد ۱۰، ۱۲ سال ہی گذرے تھے ابتدائی مدرس عربی کی حیثیت سے ان کی محنت کا رنگ قابلِ دید تھا اور عمر کے اس دوراہے پر جذبہ، لگن اور آگے بڑھنے کا جیسا جنون ہونا چاہئے وہ ان میں موجود تھا زمانہ تدریس میں جس فن کی کتاب بھی انہیں ملی اس کی تدریس سے وہ عاجز نہ ہوئے، ان سے جن لوگوں نے بخاری اور ترمذی پڑھی وہ

بھی اور جنہوں نے مشکوٰۃ اور بیضاوی پڑھی وہ بھی، جن کو جلالین اور متنبّی پڑھنے کا موقع ملا، یا جو شرح وقایہ، ہدایہ، ملا حسن کے طالب علم رہے ان کا اس پر اتفاق ہے کہ شاہ صاحبؒ نے ہر کتاب کا حق ادا کیا، طلبار کے اعتراضات اور اشکالات کو چٹکیوں میں حل کیا اور ہر درس میں مدلل جوابات دیتے جو طلبار ذہین اور شوقین ہوتے ہیں اور اگلے سبق کا مطالعہ کر کے آتے ہیں وہ بسا اوقات رعب جمانے اور کبھی واقعی مسئلہ سمجھنے کیلئے اشکالات کی جھڑی لگا دیتے ہیں، شاہ صاحبؒ اول تو کوئی پہلو تشنہ چھوڑتے نہ تھے، اور اگر ایسا موقع آ بھی جاتا تو مجبور نہ ہوتے۔

مطالعہ ان کی عادت کا حصہ تھا میرا خیال ہے کہ مطالعہ کا ایسا ذوق اور پابندی بہت کم لوگوں کے یہاں ہوگی درسی کتابوں کے مطالعہ کا تو سبھی اساتذہ اہتمام کرتے ہیں مگر خارجی مطالعہ پر مستقل کئی گھنٹے لگانا اور دینی، علمی، تحقیقی، مذہبی کتابوں کا بڑا ذخیرہ بلکہ عظیم ذخیرہ اپنے پاس رکھنا اور استفادہ کرنا ہر کسی کے لئے ممکن نہیں اخبار بینی بھی معمول میں شامل تھی اور صبح کے وقت آٹھ سے نو بجے کے درمیان یہ کام انجام دیا جاتا آنے والے رسائل وجرائد بھی صرف الماری کی زینت نہ بنتے بلکہ وہ بھی دیکھے اور پڑھے جاتے یہاں تک کہ طلبار کی کاوشوں اور تصنیفی کوششوں کو بھی وہ نظر انداز نہ کرتے پھر مطالعہ سرسری نہ ہوتا، پورے انہماک اور استغراق کا معاملہ تھا۔

اس زمانے کی ان کی تقریریں، شعلہ تھیں، آگ تھیں، جوش، بلندی، رعنائی اور شباب کی بھرپور قوتیں ان کا سرمایہ تھیں، آغاز ہی سے مجمع پر چھا جاتے اور آخر تک یہی کیفیت رہتی بہت سے مقررین انتہائی پست آواز میں ابتدا کرتے ہیں پھر درمیان میں کچھ اُبال سا آتا ہے اور آخر میں پھر وہی بجھا بجھا سا انداز، جیسے میلوں کا سفر طے کر کے آنے والا بوجھل قدموں سے چلتا اور اس کے ہر انداز سے تھکن کا اظہار ہوتا ہے، شاہ صاحبؒ اس قبیل کے مقررین میں سے نہیں تھے۔

ان کے یہاں قرآن کے ساتھ ساتھ حدیث کے حوالے خوب تھے؛ بلکہ حدیث کا غلبہ زیادہ تھا۔ پھر بزرگانِ دین، اسلاف اور اکابر کے واقعات نوکِ زبان رہتے، واقعات کا نہ ختم ہونے والا خزانہ تھا اور اپنے بڑوں کے تقویٰ، طہارت، رسوخ فی العلم، حکمت وموعظت، حزم واحتیاط، فراست ودانائی کے قصے اور سوانحی ابواب کے وہ گویا حافظ تھے۔ درمیان درمیان میں ان کے پرمزاح جملے اور بے ساختہ اشارے تقریر کا لطف دوبالا کردیتے تھے۔ اصل موضوع سے اچانک دوسرے موضوع کی طرف مڑ جانا اور ایک واقعہ کو ادھورا چھوڑ کر دوسرے واقعہ کو شروع کردینا، پھر اپنی اصل ترتیب کی طرف لوٹ آنا، ان کی یادداشت، حافظہ اور اپنے فن پر بھرپور گرفت کی علامت تھے صاف شفاف لب ولہجہ، بے ساختگی اور برجستگی، ادائیگی کا حسن، جملوں کی خوبصورتی، الفاظ کا انتخاب، پرشکوہ انداز، مترادفات کے بھی کسی حدتک استعمال نے ان کے خطاب کی شان کو بڑھا دیا تھا۔ دینی اور مذہبی جلسوں کا سماں دیگر تھا اور سماجی وسیاسی پروگراموں کی کیفیت دوسری تھی ہر دو اسٹیج کے تقاضے اور فرق پر وہ گہری نگاہ رکھتے تھے اور دونوں جگہ ان کی انفرادیت کی روشنی پھیلتی۔

چہرہ شناسی بھی ان کا خاص جوہر تھا، اجنبی ہو یا شناسا اس کی حرکات وسکنات، چہرہ بشرہ سے وہ فوراً اندازہ لگا لیتے تھے کہ آنے والا اس وقت کس کیفیت سے دوچار ہے، کس ادھیڑ بن میں مبتلا ہے یا کن الجھنوں سے لڑ رہا ہے۔ اس کے دل اور دماغ میں کون سے خیالات پرورش پا رہے ہیں آنے والے کی مراد اور مدعا کو ایک نظر ڈالتے ہی سمجھ لیتے اور پھر ان کی فراست اور دانائی بھی ان کی رہنما بنتی۔

وہ بڑی سے بڑی شخصیت سے مرعوب نہ ہوتے تھے ہاں علم وفضل، کمالات اور خصوصیات کے حامل افراد سے متاثر ہوتے اور ان کی خدمات کو سراہتے ان کی نشست وبرخاست، گفتگو اور بول چال سب سے الگ تھی، مجلس کیسی بھی ہو اور حاضرین کم ہوں

یا زیادہ سب کی توجہ ان ہی کی جانب لگی رہتی۔ انتہائی نفیس طبیعت کے مالک تھے نفیس ذوق رکھتے تھے اور زندگی کے شب و روز میں یہ نفاست ہر جگہ نظر آتی تھی، طبیعت میں نزاکت بھی بیحد تھی مگر یہ نزاکت دوسروں کے لئے زحمت نہ بنتی تھی، وہ شاہانہ انداز اور نظیف و پاکیزہ عادات رکھتے تھے۔

اپنے اوقات کو انہوں نے مختلف اُمور انجام دینے کے لئے تقسیم کر رکھا تھا فجر کی نماز سے فارغ ہوتے ہی سیر کیلئے نکل جاتے تیز قدموں کے ساتھ دو تین کلومیٹر چلتے واپسی پر تلاوتِ کلام پاک، تسبیحات اور اوراد و وظائف میں مصروف ہوتے لگ بھگ آدھ گھنٹہ آرام کرتے اور پھر اخبارات ان کے سامنے ہوتے اور اس کے بعد درسی مطالعہ کی شروعات ہو جاتی۔ بخاری شریف کا درس کبھی آخری گھنٹوں میں اور کبھی مغرب بعد دیتے، ایک زمانے میں عشاء بعد کا معمول تھا ساڑھے بارہ یا ایک بجے دن میں درس سے فارغ ہوتے اور پھر دوپہر کا کھانا کھا کر قیلولہ فرماتے ظہر کی نماز پڑھ کر ڈاک میں آنے والے خطوط کو پڑھ کر کبھی خود جواب لکھتے اور کبھی کسی اور سے اسی وقت یا مغرب بعد جوابات تحریر کراتے عصر کی نماز پڑھ کر پھر چہل قدمی ہوتی اور مغرب کی نماز پڑھ کر وہ اپنی جگہ بیٹھ جاتے اور اذان عشاء تک مضامین، مقدمات یا تقریظات لکھنے لکھانے کا سلسلہ چلتا اور اگر کسی کتاب پر کام کر رہے ہوتے تو اس کام کو بھی انجام دیتے۔ اذان عشاء پر رات کا کھانا، عشاء کی نماز کی ادائیگی اور پھر ایک گھنٹے سے زائد تک بڑی پابندی، یکسوئی کے ساتھ پھر دعاؤں اور اوراد و وظائف اور مختلف تسبیحات کا سلسلہ چلتا دس بجے سے رات بارہ بجے تک ان کی مجلس ہوتی اور مجلس ختم ہونے کے بعد وہ پھر وضو کر کے مصلی پکڑ لیتے اور کافی وقت کے بعد سونے کے لئے بستر پر جاتے اور پھر اگلی صبح سے یہی معمول شروع ہو جاتا۔

تعبیر خواب میں ان کو ملکہ حاصل تھا اس فن میں یقینی طور پر وہ آخری شخص تھے یوں تو

ہر کوئی تعبیر خواب کا دعویدار ہے مگر اس فن کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ خلاق حقیقی کی عطا کردہ غیر معمولی صلاحیتیں بھی ان کے ہمرکاب رہتی تھیں خواب کو بغور سنتے اور ایک ایک جز پر ان کی توجہ رہتی پھر کڑی سے کڑی ملا کر خواب کی تعبیر بیان کرتے ادھر خواب دیکھنے والے نے خواب بیان کیا اور ادھر ان کا براق ذہن نتائج اخذ کرنے یا تعبیر پیش کرنے میں لگ گیا اور پھر تعبیر خواب میں وہ ذرا بھی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے، تعبیر عقل وفہم کے قریب تر ہوتی، اشارات کی زبان وہ بخوبی جانتے تھے اور خواب کی مختلف کیفیتوں سے تعبیر کے قریب پہنچ جاتے تھے ہر روز ہی کوئی نہ کوئی شخص تعبیر معلوم کرنے کے لئے پہنچتا۔

تعویذات وعملیات کا شوق بالکل نہ تھا ہاں اس سلسلہ میں پہنچنے والوں کو دعاؤں کی تاکید کرتے اور زیادہ تر قرآنی دعائیں اور زبانِ رسالت سے ادا ہوئی دعاؤں کو پڑھنے کی ہدایت کرتے، میری والدہ مرحومہ اس سلسلہ میں ان کی بڑی معتقد تھیں ان کے شدید اصرار پر انہیں تعویذ بھی دیدیا کرتے تھے اور وہ بھی ہر پریشانی اور ضرورت کے سلسلہ میں ان ہی سے رجوع کرتیں، وہ بھائی انظر، بھائی انظر کہہ کر تعویذ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتیں، ایسے ہی چند لوگ اور ہوں گے جن کا پیہم اصرار اُنہیں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیتا تھا۔

ان کو خداوند قدوس نے عجیب سانچے میں ڈھالا تھا اور یہ سانچہ سب سے الگ اور جدا تھا ان کو اللہ نے جو عظمت اور مقبولیت عطا کی تھی وہ ہزاروں کی موجودگی میں بھی متاثر نہ ہوتی تھی ان کے ہم پیشہ یا ہم عصر بھی اگر کسی جگہ بڑی تعداد میں موجود ہوں، تب بھی نگاہیں صرف انہیں تلاش کرتی تھیں، بہر حال انہوں نے صرف اپنے والد کی علمی یادوں کو ہی زندہ نہیں کیا بلکہ اپنی ذاتی لیاقت، صلاحیت اور کمال کی بھی ایک مثال قائم کی اور ایسی مثالیں قائم کرنے والے افراد کی ہماری صفوں میں بیحد کمی ہے اور دن بہ دن ان راستوں پر اندھیروں اور ظلمتوں کی حکمرانی قائم ہوتی جارہی ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ

شخصیت کے چند پہلو

حضرت امام العصر علامہ سید انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہ کا وصال ۱۳۵۲ھ میں ہوا ان کی کل ۵/اولاد تھیں بڑی صاحبزادی عابدہ خاتون ۱۳۵۷ھ میں واصل بحق ہوئیں، ایک صاحبزادے اکبر شاہ مرحوم ۱۳۵۹ھ میں اپنے خالق کے حضور حاضر ہوگئے، دوسرے صاحبزادے جناب سید محمد ازہر شاہ قیصر مرحوم ۱۴۰۶ھ میں دنیا سے رخصت ہوئے انہوں نے ۶۵ سال کی عمر پائی فارسی کی تکمیل کے بعد محض ابتدائی عربی درجات کی تعلیم حاصل کرسکے مگر موروثی ذہانت، حافظہ اور ذاتی مطالعہ کی بنار پر میدان ادب وصحافت کو اپنے لئے منتخب کیا تقسیم ہند سے پہلے اور تقسیم ہند کے بعد بے شمار شہرۂ آفاق اخبارات وجرائد میں ۵۰ سال تک ان کے مقالات ومضامین شائع ہوتے رہے اورانہوں نے اپنے قلم سے اپنے والد کے نام اور کام کو زندہ رکھا ایک صاحبزادی راشدہ خاتون (جو مولانا سید احمد رضا بجنوریؒ صاحبِ انوار الباری) کے عقد میں تھیں ۱۴۲۴ھ کو جان جاں آفریں کے سپرد کرگئیں آخری نشانی محدث کبیر حضرت مولانا سید انظر شاہ کشمیریؒ کی صورت میں پورے ۸۲ سال موجود رہی بالاخر ۱۹/ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ بروز شنبہ مطابق ۲۶/اپریل ۲۰۰۸ء کو دیکھتے ہی دیکھتے موت کی وادیوں میں جاسوئی یوں براہ راست حضرت بڑے شاہ صاحب کی سبھی اولاد نے دنیا سے پردہ کرلیا ان کے سب بچوں کو اپنے والد کے پہلو اور ان کے قبر کے آس پاس ہی تاقیامت سونے کی جگہ ملی۔

پچھلے حادثات کے مقابلہ میں حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب کا حادثۂ وفات یوں زیادہ رنج والم اور حزن وملال کا باعث بنا کہ اپنے بزرگ والد کی اکثر اداؤں کو انہوں نے اختیار

کرلیا تھا اوران کی علمی عظمتوں کو مزید عظمتیں بخشنے کا عمل ان کے ذریعہ جاری تھا یہاں یہ ذکر کرنا بھی بے محل نہ ہوگا کہ حضرت بڑے شاہ صاحبؒ کے تلامذہ نے اپنے گرامی قدر استاد کے کمالات کو دور دور تک پھیلایا آپؒ کی شخصیت کے مقدس پہلوؤں کو سامنے لانے میں ان کی چاہتوں اور الفتوں کا بڑا دخل ہے یوں کہنا زیادہ درست ہوگا کہ ہر شاگرد کے خون میں حضرت شاہ صاحبؒ کی محبت خون بنکر گردش کررہی تھی ان کے علم وفضل اور علوم ومعارف کی حفاظت، ان کا تعارف اور انفرادیت کا مسلسل بیان ہر صورت میں جاری رہا گھر سے بھی اس معاملے میں کوئی کوتاہی نہیں برتی گئی یہی وجہ ہے کہ جہاں حضرت بڑے شاہ صاحبؒ رسوخ فی العلم کی بنار پر زندہ رہے، بے پناہ مطالعہ، وسعت معلومات، تمام علوم وفنون پر گہری اور ناقدانہ نظر کی وجہ سے بھلائے نہیں گئے وہیں ان کے دو فرزندوں جناب سید محمد ازہر شاہ قیصر مرحوم اور حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحبؒ کی محنتوں نے بھی اپنا رنگ دکھایا۔

حضرت مولانا سید انظر شاہ کشمیریؒ نے یوں تو اپنے زمانۂ تدریس میں تمام علوم وفنون کی کتابیں پڑھائیں مگر تفسیر وحدیث کا میدان ان کی صلاحیتوں کے بھرپور اظہار کے لئے نہایت موزوں قرار دیا جاسکتا ہے منطق وفلسفہ، ادب ومعانی، صرف ونحو، فقہ واصولِ فقہ سب جگہ برسہا برس تک وہ چھائے رہے اور کبھی بھی ان کا سفر دشواریوں کا شکار نہ ہوا، وہ جس سمت میں چلے ان کے قدموں کی آہٹ گونجتی رہی اور ان کے وجود کے اجالوں سے علمی دنیا کے نور میں اضافہ ہوتا رہا وہ تیز رفتاری کے ساتھ بلکہ برق رفتاری سے آگے بڑھتے رہے جس طرح صبح وشام کے ٹہلنے میں اکثر ان کو تیزی سے چلتا ہوا دیکھا گیا اسی طرح تدریس میں بھی ان کا یہی معاملہ تھا وقت گذرتا رہا یہاں تک کہ ۱۹۷۸ء میں انہیں بخاری شریف مل گئی پہلے سال ہی میں ان کے درس نے ایک نئی لذت، نئے انداز اور نئے لطف سے آشنا کیا، نئے جہانوں کی سیر کرائی، خوشگوار تبدیلی کا احساس جاگا اور پڑھنے والوں کو نئے پن کی کیفیت محسوس ہوئی یہ بات نظر انداز کرنے والی نہیں ہے اسے ہم ان کے کمال اور اختصاص کا حصہ قرار دے سکتے ہیں۔

وہ اپنے اندازِ تکلم اور اندازِ تخاطب کی وجہ سے بھی پہچانے جاتے تھے سچ پوچھئے تو یہ رنگ بھی ان کا اپنا ہی تھا وہ جب درس دیتے تو مزاج کی شگفتگی ،طبیعت کی شادابی ،فطری بذلہ سنجی کے نمونے تو سامنے آتے ہی ان کی تحقیق ،ان کی معلومات ،ان کی گہری علمی بصیرت اور وسعت بھی مثال بنتی لگ بھگ دو سے ڈھائی گھنٹے کے درمیان ان کا بخاری کا درس جاری رہتا نہ آواز پست ہوتی اور نہ تھکن کے آثار دکھائی دیتے ایک دریا تھا جسے ہر صورت میں بہنا تھا یہ بہاؤ اور اپنی منزل تک پہنچنے کا عمل ایک فطری عمل تھا جو ۳۰ برس تک ہر رکاوٹ کو عبور کرتا ہوا اپنے وقت پر شروع ہو کر اپنے وقت پر ختم ہوتا۔

ان کی تقریر اور تحریر کو میں اس مضمون کا حصہ نہیں بناؤ نگا ہاں ان کی نجی مجلسوں اور واردین وصادرین سے ان کی ملاقات کا کچھ حصہ ذکر ضرور کرونگا عشار کی نماز کے بعد تقریباً ایک گھنٹے اوراد و وظائف میں مشغول رہتے اور پھر مجلس شروع ہوتی اس مجلس کے شریک ایک کے بعد ایک کر کے پہنچتے رہتے اور حضرت شاہ صاحبؒ کے اطمینان سے بیٹھنے کا انتظار کرتے ۱۲ ؍ بجے رات تک یہ مجلس چلتی یہاں عوام وخواص کی تخصیص نہ تھی اور نہ کسی کے آنے پر پابندی جس کا جی چاہتا شریک مجلس ہو جاتا مگر روز کے آنے والوں کی تعداد عموماً یکساں رہتی اس مجلس میں جہاں علمی ،دینی، تحقیقی گفتگو ہوتی اخبارات کی خبریں ،حکومت کی کارگذاریاں ،سیاسی جماعتوں کی سرگرمیاں، قومی رہنماؤں کی مصروفیات، عالم اسلام کے مسائل ،حالات حاضرہ، عالمی سیاست اور بین الاقوامی سطح پر رونما ہونے والے واقعات بھی زیر بحث آتے شاہ صاحبؒ بھی رائے دیتے دوسروں کی رائے بھی سنتے اور کمال ضبط کے ساتھ اپنے سیاسی نظریات پر شدید تنقید کرنے والے اپنے چھوٹوں کی باتوں پر نہ خفا ہوتے اور نہ بے توجہی کا معاملہ کرتے۔

حق کہنا مشکل کام ہے مگر حق سننا اس سے بھی زیادہ دشوار امر ہے شاہ صاحبؒ دونوں ہی کام بخوبی انجام دیتے تھے ضد بھی ان کی طبیعت میں نہ تھی اگر ان کا کوئی موقف کمزور ہوتا تو رجوع میں کوئی تامل نہ کرتے اور سامنے والے کے موقف کو نہ

صرف تسلیم کرتے بلکہ سراہتے بھی ہمارے بہت سے بزرگوں کی ادا یہ ہے کہ ان کے یہاں سننے کے لئے تو ہمہ تن گوش رہنے اور بولنے کے معاملے میں گونگے ہونے کا ثبوت دینا پڑتا ہے اور جو کہا جائے اسے بے چون وچرا ماننے شاہ صاحبؒ کا معاملہ ایسا نہیں تھا وہ اپنے سے آدھی عمر والوں کے تبصروں بلکہ غصہ سے بھی ناراض نہ ہوتے یہ ان کی بڑی خوبی تھی جو آہستہ آہستہ ہماری مجلسوں سے ختم ہوتی جارہی ہے۔

ان کی گفتگو میں عجب چاشنی تھی جب وہ اپنے مخصوص انداز میں پوچھتے ''ہاں بھائی کیا حال ہے کیسے ہو، کیا کررہے ہو'' تو زبان کی شیرینی اپنائیت کی مٹھاس اور لہجہ کی لطافت جسم وجاں میں شہد سا گھول دیتی اور کئی کئی روز یہ ذائقہ باقی رہتا۔

مسلسل چھ ماہ کی بیماری کا زمانہ قریب سے دیکھا اور پل پل ان کی بدلتی کیفیت بھی سامنے رہی مگر یہ گمان قطعی نہیں تھا کہ وہ اتنی جلد اور اس طرح ہمارے سامنے سے گذر جائیں گے ان کی صحت قابل رشک تھی اور جس طرح پرہیز واحتیاط کا انہوں نے اپنے گرد حصار قائم کررکھا تھا اس میں کسی مہلک بیماری کا تصور بھی نہیں تھا طبیعت بگڑی تو وہ دہلی لیجائے گئے طبیعت سنبھلی اور بہتری کے آثار نظر آئے تو وہ دیوبند آگئے اور وقفہ وقفہ سے یہ سلسلہ چلتا رہا آخری بار ان سے ۱۱/اپریل ۲۰۰۸ء کو ملاقات ہوئی اور ۱۲/اپریل کو پھر دہلی روانہ ہوگئے یہاں سے ۲۶/اپریل ۲۰۰۸ء کو ان کا جسد خاکی دیوبند لایا گیا اور اس طرح اپنے وقت کے عظیم محدث، نامور عالم، بلند کردار انسان، بے مثال خطیب، ممتاز ومنفرد وادیب وانشار پرداز، مختلف کمالات وامتیازات کی مالک شخصیت، بلند مرتبہ استاذ اور تاریخی عظمتوں کے حامل مدرس کا سفر زندگی تمام ہوا۔

دیکھنا یوں بند ہوجا ئینگی آنکھیں ایک دن
آپ یوں سمجھیں گے آرام سے نیند آگئی

❁ ❁ ❁

محدّثِ جلیل کی زندگی کے چند گوشے

انسان کا ایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف سفر جاری ہے، کبھی وہ زندگی کے راستوں پر تیز رفتاری کے ساتھ چلتا دکھائی دیتا ہے اور کبھی خاموشی کے ساتھ موت کو سینے سے لگا لیتا ہے، جانے والا تو چلا جاتا ہے مگر اپنے پیچھے تڑپنے اور سلگنے کے لیے اولاد، عزیز واقارب، شاگردوں اور عقیدت مندوں کو اس طرح چھوڑ جاتا ہے کہ ؎

زندگی ایک سلگتی ہوئی چتا ہے ساحرؔ
شعلہ بنتی ہے نہ بجھ کر یہ دھواں ہوتی ہے

کا منظر سامنے رہتا ہے اور اس طرح دنوں، ہفتوں اور مہینوں بلکہ سالوں سلگنے کا عمل چلتا ہے اور پھر یہ احساس اس وقت زیادہ شدید ہو جاتا ہے جب جانے والے کی جگہ لینے والا کوئی دوسرا نہیں ہوتا اور جس طرف نظر اٹھتی ہے مایوسیاں ہی حصہ میں آتی ہیں۔ کل تک حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب مسعودی نور اللہ مرقدہ ہمارے درمیان موجود تھے مگر آج وہ اپنے جسم خاکی کے ساتھ ہزاروں من مٹی کے نیچے آسودۂ خواب ہیں اور اب کوئی لمحہ ایسا نہیں آئے گا جب وہ ہمارے سامنے موجود ہوں اور ہم ان کو دیکھ کر قلب وروح کی راحت کا سامان فراہم کریں، شخصیات سے دامن نہ کل خالی تھا نہ آج خالی ہے مگر ہمہ جہت انسانوں سے یہ دنیا یقیناً خالی ہو چکی ہے اور ایسے افراد نایاب ہو گئے ہیں جو فکر وعمل، علم وفضل، ذہانت وفطانت اور تدبر وبصیرت کا پیکر تھے انکی تنہا کی ذات اداروں اور اکیڈمیوں پر بھاری تھی، شاہ صاحب کا یہ اختصاص نہیں کہ وہ مدرس تھے، مقرر وخطیب تھے، نثر نگار اور انشاء پرداز تھے، مفسر ومحدث تھے، مدبر ومفکر تھے، بلند اخلاق وبلند کردار تھے، اسلاف کی بزرگانہ اداؤں کے پاسبان

تھے، تاریخ اور روایتوں کو ان سے جلا ملتی تھی۔ بلکہ ہر جگہ اور ہر موقع پر ان کی انفرادیت اور کمال کی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور جہاں بھی وہ ہوتے یہ خیال ہر صورت میں باقی رہتا کہ شاہ صاحبؒ ہمارے درمیان موجود ہیں اور ان کے بغیر کوئی بھی علمی، دینی، تحقیقی ،تبلیغی، ادبی کام انجام دینا مشکل ہے یہ بڑی بات ہے کہ انھیں نظر انداز کرنے کی کوئی شخص ہمت نہیں کر پاتا تھا بلکہ ان کے موجود نہ ہونے سے ایک بڑی کمی ضرور محسوس کی جارہی ہے دیوبند کی زمین، گلی کوچے اور در و دیوار مسلسل اس کی گواہی دے رہے ہیں کہ اس کے سائے میں بیٹھ کر اور سینہ پر کھڑے ہوکر ہزاروں بار حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنی سحر انگیز خطابت سے مسحور کئے رکھا، ان کی شعلہ بیانی کا ہر شخص دیوانہ تھا وہ بولتے تو مجمع پر سکوت طاری رہتا کان ان ہی کی جانب لگے رہتے ان کے ہر ہر جملے اور انداز پر خون تیزی سے جسم میں گردش کرنے لگتا یہ ناممکن تھا وہ خطاب کررہے ہوں اور سامعین ادھر اودھر متوجہ ہوں انھوں نے عام انداز اور روش سے ہٹ کر اپنا ایک الگ انداز پیدا کیا تھا یہ ایسا انداز تھا کہ جس کی نقل کی خواہش سب کے دلوں میں پیدا ہوئی اور بہت سے کامیاب نقل کرنے کے باوجود ان کے قریب نہ پہنچ پائے اور یہ حسرت ان کے دل ہی میں رہی کہ وہ انظر شاہ بنیں۔

تحریر وانشاء میں انھوں نے اپنے ہی چراغ جلائے، ماہنامہ نقش، پندرہ روزہ یثرب اور اب رسالہ محدثِ عصر ان کی قلمی توانائیوں اور اعلی فکری صلاحیتوں، علمی و تحقیقی مقالات کا مرکز تھا، پچاس سال سے زائد تک ہندوپاک کے ہزاروں رسائل واخبارات میں ان کے رشحاتِ قلم نمایاں جگہ پاتے رہے اور ان کی تحریروں کو ہمیشہ ذوق وشوق اور دل چسپی کے ساتھ پڑھا گیا، ان کی تحریر تقدس و پاکیزگی کے جذبات ابھارتی، حسن عمل کی دعوت دیتی، صالح فکر کی آبیاری کرتی نور و نکہت میں ڈوبا ہوا ان کا لب ولہجہ ندرت وانفرادیت کی منزلیں طے کرتا اور ہر تحریر کے اختتام پر یہ تشنگی باقی رہتی کہ کاش یہ تحریر ختم نہ

ہوتی اور صفحات کے صفحات ہمارے سامنے رہتے رسالہ دارالعلوم دیوبند میں پہلے بھی اور والد مرحوم جناب سید محمد ازہر شاہ قیصرؒ کی ادارت کے زمانے میں تو ان کے مضامین خوب خوب شائع ہوئے ہر موضوع پر انھوں نے داد تحقیق دی اور بے شمار کتابوں پر ان کے بصیرت افروز معلومات افزا تبصرے بھی پابندی کے ساتھ چھپتے تھے۔

ریڈیو اسٹیشن کے لئے بھی انھوں نے تقریریں لکھیں اور کم وقت میں مکمل بات کہنے کا انھوں نے یہاں بھی ہنر دکھایا اور زبان بھی وہ رکھی جو ریڈیو سننے والوں کی سماعتوں کو بھلی معلوم ہوتی نہ ثقیل گفتگو، نہ عربی فارسی تراکیب نہ گنجلک بیان، سادہ سہل اور دلکش تحریریں جو سبکی سمجھ میں آتیں اور جن کو سب سننا چاہتے۔ ذہن رسا، فکر بلند، خیال خوبصورت اور نادر اسلوب تو ہر جگہ رہا اور تدریس بھی ان خوبیوں سے خالی نہیں رہی چھوٹے تو کیا بلکہ معاصرین بھی اور دوسری ممتاز درسگاہیں بھی ان کے انداز تدریس کو رشک سے دیکھتیں اور یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوتیں کہ شاہ صاحبؒ واقعتا شاہ صاحب ہیں ان کا کوئی بدل نہیں ہے۔

چھوٹوں کے ساتھ شفقت کا معاملہ بھی عجیب تھا، مہمان نواز بھی خوب تھے، اپنے شہر اپنے حلقے کے لوگ بلکہ اجنبی بھی ان کی ضیافت سے لطف اندوز ہوتے اور اگر کبھی کسی شہر میں ان کی بستی کا کوئی آدمی نظر آجاتا تو اسکی پذیرائی کی تو انتہا ہی کردیتے ہر دسترخوان پر اپنے قریب بٹھاتے اور مختلف کھانے اپنے ہاتھ سے اس کو دیتے ایسے مواقع پر ان کے اخلاق، اخلاص اور محبت کا جو جذبہ ہوتا تھا اس کا بیان ممکن نہیں۔

غربا کی مدد اور ضرورت مندوں کی خبر گیری بھی فرماتے مگر یہ مدد اور خبر گیری اسی نوعیت کی تھی جس میں تاکید ہے کہ دوسرے ہاتھ کو پتہ نہ چلے بڑی خاموشی کے ساتھ یہ کام انجام دیا جاتا اور قریب بیٹھنے والے بھی واقف نہ پاتے، کسی یتیم بچی کی شادی ہے کوئی مہلک مرض میں گرفتار ہے۔ شاہ صاحب کے یہاں سے سب کا حصہ پہنچتا کسی کا خر

اب حال سنتے تو افسوس کا اظہار کرتے پھر جو کچھ بھی بن پڑتا اس سے دریغ نہ کرتے۔

ملی درد ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا خصوصاً مسلمانان ہند کی زبوں حالی، معاشی تنگی، روزگار کی کمی، غربت کی زیادتی، فکری انحطاط، عملی کمزوری، سطحی سوچ، عزم وارادے سے محرومی اور فکر وعمل سے دور ہو جانے کا المیہ ان کے درد کو بڑھاتا تھا، سیاسی میدان میں مسلمانان ہند کی صحیح رہنمائی اور سماجی ترقی کے لئے وہ ہمیشہ کوشاں رہے یہی وجہ ہے کہ تنظیم علمائے ہند بھی انھوں نے قائم فرمائی اور اس کے پلیٹ فارم سے بے پناہ مصروفیات کے باوجود عمل اور بیداری کا پیغام دیا اور تنظیم کو متحرک وفعال رکھا

ان کا ۱۵، ۲۰ سال رمضان کے مہینہ میں برطانیہ جانے کا معمول رہا مگر پچھلے دو رمضان انھوں نے دیوبند ہی میں گذارے اور مسجد علامہ انور شاہ میں عصر اور عشار کے بعد ان کے دینی وتبلیغی بیانات کا سلسلہ شروع ہوا۔ اب وہ تھک گئے تھے اور باوجود کہ ان کی صحت نوجوانوں کے لئے بھی رشک کا باعث تھی مگر عمر سے کوئی کہاں تک پنجہ آزمائی کر سکتا ہے، رمضان گذرا عید آئی ابھی شوال کا نصف مہینہ بھی نہیں گذرا تھا کہ وہ بیمار ہوئے اور دن بہ دن گرتے ہی چلے گئے صحت وتوانائی نے منھ موڑ لیا پھرتی وچستی کی جگہ کمزوری اور نقاہت نے پر پھیلا دئے اور وہ شمع کی صورت پگھلتے رہے ۲۶/اپریل ۲۰۰۸ء کو یہ شمع بجھی اور ہر سو سناٹوں اور ظلمتوں کی حکمرانی قائم ہوگئی سدا رہنے والی ذات اللہ کی ہے باقی جو کچھ بھی ہے فنا ہونے کے لئے ہے مگر اس احساس کو کس طرح ختم کریں کہ ؎

زمیں لوگوں سے خالی ہو رہی ہے
یہ رنگِ آسماں دیکھا نہ جائے

❁ ❁ ❁

حضرت شاہ صاحبؒ کی کچھ خاص ادائیں

حضرت شاہ صاحب اپنی عادات وشمائل اور اخلاق وعمل کے اعتبار سے بھی امتیازی حیثیت کے مالک تھے ان کے کاموں کے اوقات متعین تھے اور اپنے تمام ہی کاموں کو متعینہ اوقات میں پورا کرلینے پر قادر بھی تھے کاموں کی ترتیب اور سلیقہ ایسا تھا کہ بے انتہار مصروفیات کے باوجود بھی ان کے معمولات متاثر نہ ہوتے تھے طبیعت میں عجلت تھی اور اول مرحلے میں کاموں کو پورا کرنے کا جذبہ اور تاکید تھی اگر کسی چیز سے وہ وحشت زدہ ہوتے تھے تو وہ کسی کا اصرار اور تقاضہ تھا اگر چند بار بھی اپنے کام کے سلسلہ میں ملاقات کرکے یا فون وغیرہ پر یاددہانی بھی کرادی تو شاہ صاحب کی عجلت پسند طبیعت اس تقاضے کا بوجھ نہیں اٹھاپاتی تھی اور ایسے ہی مواقع پر وہ گھبراہٹ کے عالم میں کہتے کہ اس آدمی کو جلد فارغ کرو، اس کا کام نمٹاؤ اور فوراً روانہ کردو جو ذرا ہوشیار اور دانا لوگ ہیں انہوں نے اس طبعی کمزوری کو سمجھ لیا تھا اور وہ چند بار کے تقاضے کے بعد اپنا کام کرالینے میں کامیاب رہتے تھے۔

دیوبند میں تو سوال ہی نہیں ہاں دیوبند کے ٦٠، ٧٠ کیلومیٹر کے اطراف میں جلسوں وغیرہ سے انہیں جو کچھ ہدیہ وغیرہ ملتا تو وہ اپنے ساتھ موجود مقررین میں سے کسی کو تھمادیتے یا منتظمین جلسہ میں سے کسی کو اشارہ کرتے یا وضاحت کے ساتھ کہہ دیتے جو کچھ بھی ہے وہ ان کی خدمت میں پیش کردو بہت بار دور دراز کے اور لمبے چوڑے اسفار میں بھی ان کا یہی معمول رہا سیر چشم، کشادہ دست، اور سخی طبیعت کے مالک تھے جو ملا مل گیا نہیں ملا سو کوئی مسئلہ نہیں اول تو ایسا ہوتا ہی نہیں تھا کہ ان کے ساتھ نہ ملنے کا معاملہ پیش آئے ان کا علم، ان کا کمال، ان کی بلند وبالا شخصیت، عظیم

نسبت اور ذاتی امتیازات عقیدت مندوں اور چاہنے والوں کو ان کے ارد گرد جمع کئے رکھتے تھے، اس لئے ہدایہ وتحائف ان کی خدمت میں خوب پیش کئے جاتے اور جن کو وہ اپنے ہاتھ سے اپنے ساتھ جانے والے لوگوں میں تقسیم فرمادیا کرتے تھے تنگ دلی اور بخل ان کے قریب سے بھی ہوکر نہیں گذرے تھے۔

یہ چیز بھی مشاہدہ میں آئی کہ شاہ صاحب سے ملنے والے ان کے مکان پر پہنچے اور ان میں سے کسی نے ان کی خدمت میں کچھ پیش کیا تو وہ سب چیزیں اندر گھر میں بھجوادیتے اور جب لوگ واپس چلے جاتے تو گھر میں آکر فرماتے ''بھائی جو کچھ یہ لوگ لے کر آئے ہیں اس کو فلاں فلاں کے یہاں بھجوادو'' حضرت بڑے شاہ صاحبؒ کشمیر سے چل کر جب دیوبند پہونچے تو ان کا کوئی والی ووارث نہ تھا برسہابرس انہوں نے تنگ دستی کے ساتھ گذارے، واقعہ یہ ہے کہ بڑے شاہ صاحب کی زندگی کا اگر جائزہ لیں، تو دنیا سے نفور کے علاوہ کچھ اور ہاتھ نہیں لگتا، قال اللہ اور قال الرسول کے پر کیف نغموں سے اپنی زندگی کو سجانے والی یہ علمی شخصیت استغنار اور بے نیازی کا ایسا پیکر تھی کہ دنیاوی ساز وسامان اور راحت وآرام کی کوئی تڑپ ان کی زندگی میں نظر نہیں آتی۔

رضائے الٰہی ان کا منشار اور کامیاب اُخروی زندگی ان کا مقصد حیات تھی، چھوٹے شاہ صاحب حضرت مولانا سید انظر شاہ کشمیریؒ بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے، اور لینے سے زیادہ دینے پر ان کی توجہ مرکوز رہتی تھی، چنانچہ ان کی مجلس کے کئی لوگ ایسے رہے جن کی وہ نہایت خاموشی اور رازداری کے ساتھ مدد فرمایا کرتے، اپنی جیب خاص سے یا پھر کسی سے کہہ سن کر۔

عیار، بد باطن اور خود غرض لوگوں پر ان کے دروازے کبھی نہیں کھلے، اور بالاتفاق دروازہ کبھی کھلا رہ بھی گیا اور وہ شخص اس سے اندر داخل ہو بھی گیا تو کچھ ہی دنوں بعد شاہ صاحب اس سے کہہ دیتے کہ بھائی کل سے مجلس میں نہ آنا تمہارے آنے

سے مجھے تکلیف ہوتی ہے'' نہ کوئی لڑائی نہ کوئی جھگڑا صاف اور بے لاگ بات نہ سازشیں اور نہ زک پہنچانے کی کوششیں انہوں نے ایسے لوگوں کو ہمشہ خود سے دور رکھا اور اگر کوئی وقتی طور پر مصاحبت حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہوگیا، تو اس کے دور ہونے میں بھی زیادہ وقت نہیں لگا انہیں آدمیوں کی خوب پہچان تھی ،اور اپنے طویل تجربہ کی بنیاد پر انسان شناسی کے بھر پور جوہر رکھتے تھے، یہی سبب ہے کہ اس قسم کی فطرت رکھنے والے لوگ خود ان سے دور بھاگتے اور دوسرے ٹھکانوں کی تلاش میں لگے رہتے، مردم شناسی عطیہ خداوندی ہے اور یہ عطیہ ان کو بھر پور اور وافر مقدار میں ملا تھا، ہاں کبھی کبھی ان کی سادہ طبیعت اس جوہر پر غالب آتی تھی اور اکا دکا ایسے لوگ ان کے حلقے یا مجلس میں داخل ہو گئے جن کو اگر داخل نہ کیا جاتا تو زیادہ بہتر تھا۔

جب کبھی وہ پریشان ہوتے اور حالات و ماحول کے اثرات ان کے یہاں دیکھنے کو ملتے، تو ان کی زبان سے عموماً یہ جملہ ادا ہوتا'' کیا کہوا کرتا ہے گا'' یہ ان کا تکیہ کلام نہیں تھا، لیکن عالم پریشانی میں بار بار یہی الفاظ ان کی زبان پر جاری ہوتے، اور یہ بھی تب ہوتا، جب معاملہ انتہا ر کو پہنچ جاتا، ورنہ وہ نہایت ہی صابر اور متحمل مزاج واقع ہوئے تھے۔

❁ ❁ ❁

حضرت شاہ صاحبؒ

اور

دارالعلوم دیوبند

شاہ صاحبؒ نے تمام تعلیمی مراحل دارالعلوم دیوبند ہی میں طے کئے اس سے پہلے پنجاب یونیورسٹی سے انہوں نے چند امتحانات ضرور دیئے تھے اور انگریزی کی تعلیم بھی حاصل کی تھی مگر خون میں دارالعلوم کی محبت گردش کررہی تھی اور زمانہ طالب علمی میں ہی ان کا اکابر دارالعلوم سے تعلق قائم ہوگیا تھا اس لئے یہ محبت دوچند ہوتی چلی گئی اور تعلیم سے فراغت کے بعد دارالعلوم ہی میں بحیثیت مدرس عربی ملازم ہوگئے اس لئے دارالعلوم سے ان کا تعلق اور رشتہ اور مستحکم ہوگیا پھر ان کی نرالی تدریس، منفرد خطابت، دل کش اور جاذب لب ولہجہ کی بنیاد پر طلبہ میں ان کی مقبولیت کے دروازے کھل گئے ہر سمت ان کا نام گونجنے لگا اور جلد ہی انہوں نے اپنی انفرادیت کا رنگ جمالیا۔

میری عمر ۸، ۱۰، برس کی ہوگی تو میں نے دارالعلوم میں صدر گیٹ کے اوپر بنے ہوئے کمرے میں شاہ صاحب کو رہائش پذیر دیکھا اور دارالحدیث فوقانی کے قریب برج جنوبی میں بھی کافی زمانے تک ان کا قیام رہا دارالحدیث تحتانی، دارالحدیث فوقانی، غلہ اسکیم کے جلسوں کیلئے سجایا گیا اسٹیج اور نودرہ کے سامنے احاطہ مولسری کا حصہ حضرت شاہ صاحب کی خطابت اور تدریس کا گواہ ہے ان کی جامع اور ہمہ گیر شخصیت نے دارالعلوم دیوبند کو تازگی، شادابی اور کیف وسرور کی نئی لذتوں سے آشنا کیا بلکہ

دارالعلوم دیوبند سے ان کی وابستگی کے بعد ہر دم ایک نیا احساس جاگا رہا بحیثیت صدر مدرس! بحیثیت ناظم تعلیمات ، بحیثیت شیخ الحدیث اور بحیثیت ناظم مجلس تعلیمی بحیثیت کارگذار مہتمم ان کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے، دارالعلوم کے ایک باکمال فرد کے طور پر انہوں نے جو گہری چھاپ چھوڑی وہ آسانی کے ساتھ فراموش نہیں کی جا سکتی ابتدائی عربی کتابوں سے لیکر چاہے میزان ہو یا مرقات، سلّم ہو یا کافیہ، ملاحسن ہو یا کنز الدقائق ، ہدایہ ہو یا بیضاوی ، جلالین ہو یا مقامات ، مشکوٰۃ ہو یا طحاوی ترمذی ہو یا بخاری ان کی تدریسی شان ہر جگہ نمایاں رہی اصاغر تو کیا اکابر بھی ان کی تدریس سے مطمئن تھے حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحبؒ ، حضرت علامہ ابراہیم بلیاویؒ ۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ ، شیخ الحدیث حضرت مولانا فخر الدین صاحب مرادآبادیؒ اور حضرت مولانا سید اختر حسین میاں صاحبؒ کے دورِ مسعود میں بھی ان کی تدریس کو تحسین کی نظروں سے دیکھا گیا۔

جب دارالعلوم میں کسی موقر مہمان کی آمد ہوتی، کسی سیاسی رہنما اور قائد کا ادھر سے گذر ہوتا، غلہ اسکیم کا اجلاس ہوتا، کسی بڑی علمی شخصیت کا تعزیتی جلسہ ہوتا یا طلبہ کی ضلعی یا صوبائی انجمنوں کے افتتاحی یا اختتامی پروگرام ہوتے شاہ صاحب کی خطابت کے ولولہ انگیز اور پُر جوش نظاروں کی چمک آنکھوں کو خیرہ کئے رہتی ہر سو انہیں کا نام گونجتا اور ہر جانب ان ہی کے چرچے ہوتے دارالعلوم دیوبند میں بھی ان کی خدمات ناقابل فراموش رہیں اور مختلف عہدوں پر رہتے ہوئے انہوں نے اپنی صلاحیتوں کی الگ دنیا بسائی دارالعلوم کی محبت ہر فرزند دارالعلوم کی طرح ان کی روح کی گہرائیوں میں اتری ہوئی تھی چنانچہ جب سن ۲۰۰۵ء میں صدر جمہوریہ ایوارڈ ان کی خدمت میں پیش کیا گیا تو انہوں نے اسے دارالعلوم، اکابر دارالعلوم اور اپنے اساتذہ کا اعزاز قرار دیا۔

اجلاس صد سالہ کے عظیم موقع پر فراہمی سرمایہ کیلئے ملک گیر دورے کئے اور اس دور میں بڑی بڑی رقمیں لا کر خزانۂ دار العلوم میں جمع کیں دار العلوم کی عظمتوں کا تذکرہ ہر صورت میں جاری رہا اپنے اساتذہ کے علاوہ تمام اکابر کی حیات وخدمات ان کے نوکِ زبان اور نوک قلم رہیں کسی مرحلے میں انہوں نے دار العلوم کو فراموش نہیں کیا حالات کی سختیوں، وقت کی شدتوں اور مصائب وآلام کے اندوہناک مرحلوں بیچارگی اور مایوسی کے اندھیروں میں بھی انہوں نے دار العلوم کی محبتوں کا چراغ بجھنے نہ دیا۔ اور جامعہ امام محمد انور کے قیام کے بعد دار العلوم کے اساتذہ کی جامعہ میں آمد ورفت جاری رہی کبھی سالانہ امتحان کے عنوان سے اور کبھی سالانہ جلسے کے موقع سے۔

❁ ❁ ❁

حضرت شاہ صاحبؒ کی بے مثال یادداشت

بڑے شاہ صاحب امام العصر حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ کی مثالی یادداشت اور بے نظیر حافظہ کی گواہی ان کے معاصرین اور تلامذہ کے بیانات اور تحریروں سے ملتی ہے بلکہ ان کے اساتذہ کرام بھی ان کے حفظ وذکا کے مداح تھے یہ صرف قصے کہانیوں کی بات نہیں بلکہ ایک سچائی ہے کہ گذشتہ کئی صدیوں میں حضرت شاہ صاحب جیسی عبقری شخصیت دیکھنے کو نہیں ملتی، خداوند عالم نے ان کو جملہ علوم وفنون میں جو درک اور مہارت عطا کی تھی وہ ضرب المثل ہے۔ان کے معاصرین بھی ان کی عبقریت کے قائل اور مطالعہ کی وسعت کے معترف تھے۔

تاریخ اسلام میں نابغۂ روزگار افراد کی کسی دور میں کمی نہیں رہی مگر ایسے افراد ضرور کمیاب رہے جو علوم عقلیہ ونقلیہ میں انفرادیت کے مالک ہوں بڑے شاہ صاحبؒ کا اصل میدان تو علم حدیث ہی رہا مگر ان کی تصانیف اور تالیفات سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ مالک کل نے انہیں ہر علم سے نوازا اور عظمتیں عطا کیں چھوٹے شاہ صاحب اپنے والد کے صحیح جانشین قرار پائے اور سب ہی جگہوں پر انہوں نے علوم انوری کی یادیں تازہ کیں، جہاں تک یادداشت اور حافظہ کی بات ہے اس میدان میں بھی حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب یادگار کی حیثیت رکھتے تھے کثیر المطالعہ تھے اور جو کچھ پڑھا وہ تمام تر جزیات کے ساتھ انہیں محفوظ رہتا تھا جس زمانے میں میری ریڈیو اسٹیشن دہلی بغرض تقریر آمد ورفت ہوئی تو کئی عنوان ایسے رہے جن پر میرے لئے لکھنا کارے دارد تھا اور وقت کی تنگی کے سبب کتابوں کو کنگھالنا بھی ممکن نہ تھا۔

تھک ہار کر بہتر صورت یہ نظر آئی کہ حضرت شاہ صاحب سے رجوع کیا جائے

میں حاضر ہوااور اپنی پریشانی کا ذکر کیا ہر بار حاضری پر پوچھتے عنوان کیا ہے بھائی میں عنوان بناتا اور پھر وہ متعلق عنوان پر اتنا مواد فراہم کردیتے کہ مکمل تقریر تیار ہوجاتی پھر کتابوں کے حوالے دیتے جاتے اور ان کی علمی و تحقیقی حیثیت پر بھی گفتگو فرماتے کبھی ایسا محسوس نہیں ہوا کہ عنوانِ تقریر سن کر شاہ صاحب پریشان ہوئے ہوں اور ان کے چہرہ پر فکر وتردد کے آثار پیدا ہوئے ہوں خندہ پیشانی کے ساتھ میری بات سنتے اور پوری بشاشت کے ساتھ معلوم بہم پہنچاتے پھر یہ بھی مشاہدہ میں رہا کہ ان کا کوئی شاگرد ۲۵، ۳۰، سال کے بعد ملاقات اور زیارت کی غرض سے حاضر ہوا اور شاہ صاحب نے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا اور گویا ہوا ہاں بھائی مولوی کیسے ہو، کہاں ہو اور کیا کررہے ہو، اخبث تم نے پڑھنے کے زمانے میں خوب ہنگامے کئے اب بھی وہی صورت ہے ۲۵، ۳۰، سال کا عرصہ معمولی نہیں ہوتا گردش زمانہ اور مرورِ ایام شکلوں اور صورتوں کو بدل کر رکھ دیتے ہیں اور موجودہ خدوخال ماضی سے کوئی مطابقت نہیں رکھتے مگر شاہ صاحب کی تیز نگاہیں اور بے مثال یادداشت آنے والے کا فوراً ادراک کرلیتیں اور وہ کسی شبہ اور شش وپنج کا شکار نہ ہوتے۔

دوران درس کتابوں کے حوالہ دیتے چلے جاتے، مصنف کے حالات بیان کرتے کتاب کے مستند اور غیر مستند ہونے کی بحث چھیڑتے ساتھ ہی ساتھ اس کا اظہار بھی ہوتا چلا جاتا کہ شاہ صاحب نے مطالعہ کا جو ذوق اور مزاج پایا ہے وہ مشکل سے کسی کو ملتا ہے اور دوسرا کوئی اس میدان میں ان کا شریک و سہیم نہیں کبھی ایسا بھی ہوا کہ ان کی خدمت میں حاضری ہوئی اور کوئی مقامی یا غیر مقامی آدمی ساتھ ہوا تو تعارف ہونے کے بعد اس شخص کے خاندانی احوال، اس کے بڑوں کا تذکرہ، مختلف حادثات و واقعات اس شرح وبسط کے ساتھ بیان فرماتے کہ وہ شخص بھی اپنے خاندانی احوال سے اس درجہ واقف نہ نظر آتا اور بعد میں اس کا اظہار کرتا کہ شاہ صاحب نے جو باتیں بیان فرمائیں ان میں

سے اکثر پر میں بھی پہلی بار واقف ہوا ہوں پرانے لوگوں اور دیو بند میں آباد مختلف خاندانوں کے متعلق جتنی معلومات شاہ صاحب کے حافظے میں موجود تھیں اور جس تفصیل کے ساتھ وہ انہیں بیان کرنے پر قادر تھے وہ ہم نے کسی اور کے یہاں نہیں دیکھا کبھی ایسا بھی ہوا کہ انہوں نے کسی موضوع پر لکھنے کی تاکید کی یا کسی کتاب کی فراہمی کا حکم دیا اور پھر اچانک انہیں سفر میں جانا پڑا ۱۵، ۲۰، دن یا مہینے بھر کے بعد ان کی واپسی ہوئی تو اول ملاقات ہی میں سلام دعا کے بعد ان کا پہلا سوال جو ہوتا وہ یہی ہاں بھائی اس کام کا کیا ہوا میں درمیانی عرصہ میں یا تو اس کام کو بھول چکا ہوتا اور کبھی یہ خیال ذہن میں جم جاتا کہ خود شاہ صاحب بھی اب اس بات کو بھول چکے ہونگے۔

ہزاروں عربی، فارسی اور اردو کے اشعار جو وہ اپنی تقریروں اور تحریروں میں نقل کیا کرتے تھے وہ صرف اپنی یادداشت کے بل پر اسی طرح اکابر کے اقوال بیان کرتے تو یہاں بھی حافظ ان کا نگہبان ہوتا کبھی رجوع کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی مثنوی مولانا روم کے ہزاروں اشعا، غالب، میر، مومن، انشار اللہ خان انشار، اقبال، جگر، احسان، جوش، سیماب وغیرہ شعراء کے دواوین پر ان کی نظر تھی اور لاتعداد اشعار ان کو از بر تھے پھر جس واقعہ کو ایک بار بیان کرتے دوبارہ اس کا بیان ہوتا صورت واقعہ اور ترتیب میں کوئی فرق نہ آتا بہت سے ایسے لوگ بھی ہمارے درمیان موجود ہیں کہ اگر وہ کسی واقعہ کو بیان کریں اور دوسری تیسری بار اس کو لوٹائیں تو ہر بار ایک نئی ترتیب قائم ہو جاتی ہے بلکہ ایک نیا واقعہ ہی موجود میں آجاتا ہے۔

❁ ❁ ❁

شاہ صاحبؒ اور دیوبند

اپنی مٹی اور اپنی زمین سے ہر شخص کو پیار ہوتا ہے جہاں انسان کی پیدائش ہوتی ہے اور وہیں وہ زندگی گذارتا ہے، وہاں کی راتیں حسین اور دن مسرتوں کے نقیب ہوتے ہیں صبح وشام کے مناظر، مصروفیات ومشاغل، تقریبات ومجالس، افراد واشخاص، رشتے اور روابط سب کے ساتھ اس کی اتنی مضبوط وابستگی ہوتی ہے کہ اس کا ذکر ہر مجلس میں چھایا رہتا ہے اور اس کے ہر انداز سے انس ومحبت کا اظہار ہوتا ہے حضرت بڑے شاہ صاحبؒ کشمیر سے چل کر جب ہزارہ پہنچے تو تن تنہا تھے ہزارہ میں انہوں نے اپنی علمی پیاس بجھتے نہ دیکھی تو طلب علم نے انہیں ایک ایسے علمی سمندر کی طرف رخ کرنے پر مجبور کیا جو اس وقت علم وعمل کا سب سے بڑا مرکز تھا یعنی دارالعلوم دیوبند شاہ صاحب دیوبند پہنچے تو نو وارد تھے اور ان کی خبر گیری کرنے والا کوئی نہ تھا اور بے شمار طلباء کی طرح وہ بھی دارالعلوم میں داخلہ کی تمنا لئے پہنچ گئے کافی وقت پریشانیوں اور بیچارگی میں گذارا آخر دیوبند ہی کے ایک خداترس انسان ان کی جانب متوجہ ہوئے اور پرسش احوال کے بعد اسی بندۂ خدا نے شاہ صاحبؒ کا دارالعلوم میں داخل کرادیا۔

دارالعلوم دیوبند میں داخلہ کے بعد کچھ ہی وقت میں ایک ذہین، مستعد اور نیک خو طالب علم کی حیثیت سے ان کی شہرت ہونے لگی ان کا طالبعلمانہ شوق اور جذبہ دیکھکر کچھ اساتذہ بھی ان کی جانب متوجہ ہوئے اور پھر بڑے شاہ صاحب کا علمی سفر عظمتوں کی نئی داستان رقم کرنے لگا حضرت شاہ صاحب نوراللہ مرقدہٗ کا علمی انہماک اس قدر تھا کہ دنیا کی کسی اور چیز سے انہیں دلچسپی ہی نہ تھی اور جب دارالعلوم میں ان کی تدریس کا آغاز ہوا تو گویا وہ تھے اور کتابوں کی وسیع وعریض دنیا، رات دن مطالعہ اور صبح وشام درس

وتدریس کا لامتناہی سلسلہ، ایک وقت وہ بھی آیا جب شاہ صاحبؒ نے حجاز مقدس ہجرت کرنے کا ارادہ فرمالیا شاہ صاحب کے اساتذہ اور ارباب اہتمام متفکر ہوئے اور شاہ صاحبؒ کو دیوبند ہی میں روکے رکھنے کی تدابیر پر غور وخوض ہونے لگا سب سے آسان اور سہل راستہ یہ نظر آیا کہ شاہ صاحبؒ کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کردیا جائے اس طرح خود بخود پاؤں میں بیڑیاں پڑجائیں گی چنانچہ گنگوہ کے ایک سادات گھرانے میں ان کا عقد ہوگیا اور یوں حجاز مقدس جانے کا ارادہ ماضی کی داستان بن گیا۔

حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحبؒ کی پیدائش دیوبند میں ہوئی، یہیں وہ پلے پڑھے، یہیں تعلیمی مراحل طے کئے اور یہیں کے افراد واشخاص کے درمیان انہوں نے زندگی گذاری فطری طور پر دیوبند کی محبت ان کے خون میں رچی بسی تھی اور یہاں کے لوگوں سے مراسم لازمی ہونے تھے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ شاہ صاحبؒ اپنے وطن کے لوگوں سے بیحد تعلق رکھتے تھے اور ہر برادری وخاندان کے افراد سے ان کا معاملہ دلی اور قلبی تھا سب کے دکھ درد میں شریک ہونا، تقریبات میں حصہ لینا اور کسی موقع پر کسی کیہاں پہنچنا ضروری ہو تو وہاں باہتمام پہنچنا کوئی نکاح پڑھانے کی درخواست لیکر آیا اور کوئی نئے مکان میں دعا، کیلئے حاضر ہوتا دونوں ہی طرح کے لوگ ان کے اخلاق اور عمل سے مطمئن ہوتے نکاح پڑھانے اور دعا، کرانے کیلئے بغیر کسی تکلف کے تشریف لے جاتے۔

شہر میں سیرت النبی ﷺ کا جلسہ ہے یا اصلاح معاشرہ کا پروگرام، ۱۵؍اگست کا موقع ہے یا کسی سیاسی اور علمی شخصیت کی آمد شاہ صاحب کو زحمت دی جاتی تو ہر صورت میں پہنچتے اپنے وطن کے لوگوں کو وہ مایوس کرنا جانتے ہی نہ تھے اگر شہر کے بچّے بھی کوئی پروگرام کرتے اور مدعو کرتے تو وہاں بھی پہنچنے میں انہیں کوئی تامل نہ ہوتا۔

غریب، نادار لوگوں یتیم بچوں اور بیوہ عورتوں کی پوری مدد فرماتے پڑوس اور اہل محلّہ کے حقوق کی ادائیگی کا ہر دم خیال رہتا دیوبند کا کوئی بھی شخص آتا اور اپنے

مسائل اور ضروریات میں ان کی مدد کا طالب ہوتا تو اسے قطعی محروم نہ لوٹاتے میں نے متعدد بار دیکھا کہ کافی لوگ ان کی نرم دلی اور کشادہ دلی کا غلط فائدہ اٹھاتے مختلف حیلوں اور بہانوں سے ان سے مدد حاصل کرتے بار بار کے تجربات اور معاملہ کو گہرائی سے جاننے کے باوجود ان کی مروّت انہیں انکار نہیں کرنے دیتی تھی۔

معاش اور روزگار کی لپیٹ میں آئے ہوئے لوگ اور بے روزگار تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے اپنے اثر ورسوخ سے ملازمتیں دلواتے، سفارشی خطوط لکھ کر دیتے، فون وغیرہ پر یاددہانی کراتے، ملک اور ریاست کے مختلف کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بچوں کے داخلوں کے سلسلہ میں پریشان والدین اور سرپرست بھی ان کے لطف وکرم سے محروم نہ رہتے مہلک بیماریوں کے شکار یا علاج ومعالجہ کی سہولتوں سے محروم لوگوں کو مختلف ذریعوں سے راحت پہنچاتے اور موقع بہ موقع ان کی مالی مدد بھی کرتے دیوبند میں علماء وفضلا کا جم غفیر ہے اور کافی حضرات اثر رسوخ والے ہیں مگر ان کی ذات سے دیوبند کے لوگوں کا کوئی بھلا نہ ہوا اور کافی تعداد تو ایسے لوگوں کی ہے کہ جن کے قریب جانا بھی مشکل مرحلہ ہے چہ جائیکہ کوئی اپنا دکھ درد بیان کرے یا اپنی پریشانی میں مدد کا طالب ہو شاہ صاحبؒ نے اس کا ہمیشہ اہتمام کیا کہ دیوبند کے لوگوں کی زیادہ سے زیادہ دست گیری ہو اور جب بھی وہ انہیں آواز دیں انہیں مایوس نہ کریں۔

❁ ❁ ❁

حضرت شاہ صاحبؒ اور درسِ بخاری شریف

امام العصر علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ کا اسم گرامی حدیث کے حوالے سے بہت ممتاز ہے اور محدثین کی صف میں اس دورِ آخر کی وہ ایک ایسی نشانی تھے جن کو نظر انداز کر کے آگے بڑھنا اب ممکن نہیں ہے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن نور اللہ مرقدہ کی حیات ہی میں بخاری شریف ان کو ملی اور انہوں نے قدیم علمی درسگاہوں کی یادیں تازہ کر دیں علمی تعمق، تحقیق کی گہرائی، طرق احادیث پر گہری نظر، فن اسماء الرجال میں درک، اقسام احادیث اور محدثین کی گرانقدر خدمات، تمام جزئیات پر واقفیت کچھ اس طرح ان کی ذات کا حصہ تھے جو ان کے بعد کسی دوسرے کا حصہ نہیں بنے ان کی درسگاہ سے نکلنے والے بے شمار نامور علماء منظر عام پر آئے اور ہندوپاک میں ان کا طویل ترین علمی دور قائم رہا حضرت مولانا یوسف بنوریؒ، حضرت مولانا ادریس کاندھلویؒ، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ، حضرت مولانا سید احمد رضا بجنوریؒ، (صاحب انوار الباری) حضرت مولانا بدر عالم میرٹھیؒ (صاحب فیض الباری) حضرت مولانا سیّد مناظر احسن گیلانیؒ، حضرت مولانا شریف احمد کشمیریؒ، حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ، حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ، حضرت مولانا قاضی زین العابدین میرٹھیؒ، حضرت مولانا منظور نعمانیؒ، حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ، حضرت مولانا شاہ عبد القادر رائے پوریؒ، شاہ وصی اللہ الہ آبادی، حضرت مولانا فخر الدین مراد آبادیؒ، حضرت مولانا عبد الرحمٰن کیمبلپوری، حضرت مولانا مفتی محمد حسین امرتسریؒ، حضرت مولانا محمد میاں دیوبندیؒ، حضرت مولانا عبد اللہ صاحب نقشبندیؒ، حضرت مولانا محمد انوری لائل پوریؒ، حضرت مولانا محمد طاہر صاحب

قاسمیؒ، حضرت مولانا شمس الحق صاحبؒ، حضرت مولانا اسلام الحق اعظمیؒ ، پروفیسر انوار الحسن شیر کوٹیؒ، ڈاکٹر مصطفیٰ حسن علویؒ، حضرت مولانا محمد صدیق صاحبؒ استاذ النحو مظاہر العلوم سہارنپور، حضرت مولانا غلام اللہ خان صاحبؒ مفسر قرآن وغیرہ کی ایک طویل ترین فہرست ہے جن کو حضرت شاہ صاحبؒ سے تلمذ کی نسبت حاصل ہے ان تمام علماء نے اپنے گرامی قدر استاذ کی خدمات، حیات اور کارناموں کو ہمیشہ زندہ رکھا حضرت شاہ صاحبؒ نے شیخ الہندؒ کی جانشینی کا خوب حق ادا کیا اور ان کا شمار شیخ الہندؒ کے باختصاص تلامذہ میں ہوا ترتیب یہ رہی کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، شیخ الہندؒ اور بغیر کسی واسطے کے علامہ انور شاہ کشمیریؒ، چھوٹے شاہ صاحبؒ کو دارالعلوم دیوبند ہی کے زمانہ تدریس میں بخاری شریف مل گئی تھی اور زندگی کے آخر لمحات تک پھر بخاری شریف کا درس جاری رہا اس سال وہ بیمار ہوئے تو بھی انہوں نے درس کا سلسلہ جاری رکھا مگر جب صحت نے جواب دیدیا اور بیماری نے غلبہ پالیا تو ظاہر ہے کچھ وقت کے لئے یہ سلسلہ منقطع ہوگیا جس طرح انکے گرامی قدر والد نے درس حدیث میں ایک انقلابی رنگ پیدا کیا اس طرح ان کے جانشین کا انداز درس بھی جداگانہ ہی رہا اور انہوں نے اسی طرز کو اختیار کیا جو ان کے والد مرحوم کا طرز تھا درس حدیث کا مکمل حق ادا کرتے اور ہر روز نئی تحقیقات اور معلومات سے اپنے درس کو سجاتے علم حدیث میں اسمائے رجال کی تحقیق اور جرح وتعدیل کا معاملہ نہایت اہم ہے اور یہ فن انتہائی مشکل ہے خود چھوٹے شاہ صاحب نے اس سلسلہ میں تحریر فرمایا ہے کہ۔

> نہ جاننے والوں سے تو کیا عرض کیا جائے جو جانتے ہیں انہیں معلوم ہے کہ حدیث کا نصف علم رجال سے متعلق ہے حدیث کی قبولیت وعدم قبولیت، صحت وضعف اور اسی قبیل کے دوسرے فیصلے داخلی پہلو سے ہٹ کر خارج میں رجال ہی پر موقوف ہیں۔ (نقش دوام ۳۹۲)

حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحبؒ کے درس میں رجالی تحقیق پر کافی زور تھا اور اس سلسلہ میں ان کی وسعت مطالعہ اور بے مثال حافظہ کا جوہر نمایاں ہے یہ کام وہی شخص انجام دے سکتا تھا جس کو علم رجال پر مکمل معلومات ہوں ورنہ تعدیل وجرح کے متضاد اقوال حدیث پڑھنے والے کو الجھا دیتے ہیں مرادِ حدیث اور فرمانِ رسول ﷺ کو سمجھنا اور اس کی گہرائی تک پہنچنا، واضح بیان اور اشاراتی زبان کی شرح وتفصیل، مختلف مسالک کے ائمہ کے بھرپور احترام کے ساتھ احناف کی رواۃ کو محفوظ رکھنا، مسلکی گروہ بندی اور عصبیت کی راہ پر نہ چلتے ہوئے اعتدال فکر کا ثبوت دینا کوئی معمولی کام نہیں ہے شاہ صاحبؒ بالیقین اپنے معاصرین میں بلند مرتبہ اور مقام پر فائز تھے ان کا درس بخاری معروف بھی تھا اور مقبول بھی، دیوبند ہی کے دورۂ حدیث کے طلبا نہیں بلکہ بیرونی درسگاہوں کے طلبا کو موقع ملتا تو وہ بھی آپ کے درس میں شرکت کا اہتمام کرتے۔

❁ ❁ ❁

حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب مسعودی

قدرت کی صناعی اور کاریگری کے لاتعداد شاہ کار اور بے شمار نمونے روئے زمین پر موجود، خدائے وحدہ لاشریک کی عظمت ورفعت کو زبانِ حال سے بیان کرتی عجیب وغریب مخلوقات اور انگنت صورتیں، ہر ایک کا رنگ جدا، ہر ایک کی کیفیت مختلف، کوئی زندگی کے ساز پر گائی گئی خوبصورت غزل، کوئی بربطِ حیات پر چھیڑا گیا حسین نغمہ، کسی میں چاندنی کا سکون، کوئی صبح دم چلتی ہوا کا مست کن جھونکا، کوئی آفتاب کی طرح زندگی کی حرارت کا اعلان، کوئی شام کی دلفریبیوں کی داستان، ہزاروں انسان مگر اپنی شکلوں، صورتوں، خصوصیات اور کمالات کے اعتبار سے قابل مدح اور لائق ستائش، سب پر خالق کی کرم فرمائیوں کے اثرات، ہر ایک اپنی ذات میں مجموعۂ اوصاف، زندگی کی تعمیر جو ہاتھ خود کرتے اور کاروانِ حیات کو نئی جہتوں، نئی فضاؤں اور نئے آسمانوں سے آشنا کرتے ان میں ایک محترم نام ہمارے مخدوم وممدوح حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب مسعودی کا بھی ہے، جو ہر حلقہ میں ''شاہ صاحب'' کے نام سے متعارف اور ہر جگہ اسی انداز پر جن کی پذیرائی اور استقبال ۵ سال کی عمر، یتیمی کے دور کا آغاز مگر شیخ سعدی کی زبان میں

بالائے سرش زہوشمندی ❁ می تافت ستارۂ بلندی

ابتدائی عمر میں انگریزی تعلیم کے لئے دہلی کا سفر کیا، دہلی اس وقت شکست وریخت کے دور سے گذر رہی تھی مگر اہلِ علم اور اصحابِ کمال کی موجودگی سے طالبین کے لئے اس میں کشش تھی، تعلیم شروع ہوئی اور کچھ وقت گذرا بھی مگر ۴۷ء کے ہنگامہ بلاخیز نے دیوبند آنے پر مجبور کردیا، پنجاب یونیورسٹی سے کچھ امتحانات دیئے گھر واپسی نے اس راہ کے دروازے بھی بند کردیئے، ازسرِ نو تعلیم کی ابتدار اور اب کی بار اسی میدان کا انتخاب جس میں ان کے نامور والد نے شہرت دوام حاصل کی، دھیمے قدموں سے سفر شروع کیا، ایک فرشتہ مولانا اعزاز علی صاحبؒ کی صورت میں ظاہر ہوا اور ان کا ہاتھ تھام لیا اور ان ہی کی تربیت، ان ہی کی توجہ اور ان کی محنت نے ایک یتیم کو جوہر قابل بنادیا۔

مولانا سید انظر شاہ صاحب نے پوری لگن، شوق اور جذبے سے ازوال تا آخر دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی، ممتاز طلبہ میں شامل رہے، ان کی انفرادیت کے غنچے چٹکنے لگے اور علمی دنیا ایک نووارد کے قدموں کی چاپ محسوس کرنے لگی، ذہین، فطین، ہوشمند، بلا کا حافظہ، کچھ پانے کا سودا، کچھ حاصل کرنے کا جنون، آگے بڑھنا سیکھا تھا، پیچھے مڑ کر دیکھنا بھی گوارا نہ کیا، زندگی کی سختیوں اور زمانہ کی ناہمواریوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے منزل کی جانب بڑھتے رہے، بقول شاعر

جس دن سے چلا ہوں میری منزل پہ نظر ہے
آنکھوں نے کبھی میل کا پتھر نہیں دیکھا

۱۳۷۲ھ مطابق ۱۹۵۲ء میں دارالعلوم سے فارغ ہوئے اور اسی سال درالعلوم میں مدرس عربی کی حیثیت سے ملازم ہو گئے، اول دن سے ان کی تدریسی صلاحیتوں کے چرچے شروع ہوئے، میزان سے ابتدار اور بخاری پر آکر ٹھہراؤ، مقامات ان کے زیر درس رہی، ملاّ حسن اور سلّم انہوں نے پڑھائی، جلالین اور بیضاوی ان کی نکتہ آفرینیوں کا مرکز بنی، مختصر المعانی، شرح عقائد اور ہدایہ میں پختگی کا ثبوت دیا، ترمذی، مسلم، ابوداؤد، مشکوٰۃ جیسی کتب احادیث بھی طویل زمانے تک پڑھانے کی سعادت حاصل رہی، فقہ وحدیث، تفسیر وکلام، منطق وفلسفہ، معانی وادب ہر جگہ شہرتوں اور محبوبیت نے ان کے قدموں تلے پھول بچھائے ۵۲ سال ان کی تدریسی زندگی کے گذر رہے ہیں، ان کے اندازِ درس اور طریقۂ درس نے مقبولیت کا دامن نہیں چھوڑا کسی فن میں نہ عاجز اور نہ کسی کتاب سے متوحش، ہر جگہ ان کی صلاحیتوں کے قطار اندر قطار چراغ روشن ہوئے اور ان کی روشنی طالبان علوم نبوت کے لئے ایک مثال بن کر سامنے رہی، خدا نے ذہن، فکر، حافظے اور افہام وتفہیم کی بے پناہ دولتوں سے نوازا اور قدرت کی ان فیاضانہ عنایات کا انہوں نے فیاضانہ استعمال کیا، دارالعلوم کے وہ چند نام جو اپنے علم وعمل، صلاحیت اور قبولیت میں شہرتوں کی منزلوں تک پہنچے ان میں شاہ صاحب کا نام نمایاں ہے وہ اپنی ذات میں ایک انجمن اور اپنے وجود میں ایک ادارہ

ہیں اس انجمن کی روشنی روز بڑھ رہی ہے اور اس ادارہ کی وسعتِ علم سے دیو بندیت کے آنگن میں صحیح عقیدے اور مثبت فکر کے پھولوں کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔
اپنے وقت کے نامور اساتذہ سے انہوں نے تعلیم حاصل کی اور ہر خوانِ علم سے خوب خوشتہ چینی کی نہ کسی فن کی بیڑیوں میں جکڑے رہے اور نہ کسی خاص علم کی زنجیروں نے انہیں باندھے رکھا، مطالعہ ان کا عمیق بھی ہے وسیع بھی اور بے پناہ بھی، زندگی کو جن اصولوں کے حوالے انہوں نے کیا ان میں سے ایک مطالعہ بھی ہے، ایام جوانی سے لیکر بڑھاپے کی اس چھاؤں تک نہ کبھی وہ اس سے بیزار ہوئے اور نہ بے توجہ، آج بھی گھنٹوں پڑھتے ہیں مطالعہ کرتے ہیں اور تب جا کر بخاری جیسی عظیم اور اہم کتاب کا درس دیتے ہیں، خارجی مطالعہ بھی ان کے معمولات کا حصہ ہے، زندگی کیا ہے؟ کیا کوئی معمہ ہے، کوئی چیستاں ہے، کوئی لاینحل مسئلہ ہے، ایسا کچھ بھی نہیں، شاہ صاحب کی زندگی کے نشیب وفراز سے جولوگ واقف ہیں اوان کی شبانہ روز جدوجہد پر جن کی نظر ہے وہ زندگی کو ایک کھلی کتاب کی طرح دیکھ سکتے ہیں کیسے انسان کی محنت اور جانفشانی کی کلیاں، چٹکتیں اور پھول بنتی ہیں، تدریس کی انفرادیت کے ساتھ ساتھ تحریر وقلم اور تقریر وخطابت میں ان کی امتیازی شان ہے، دونوں میدانوں میں وہ اس قافلہ سالار کی طرح ہیں، جس کے پیچھے چلتے قافلے اپنی پوری توانائی اور طاقت صرف کر دیتے ہیں اور اس کے قدموں کے نشانات پر چل کر ہی منزل پر پہنچتے ہیں، دارالعلوم کا یہ امتیاز ہے کہ اس نے علوم وکمالات کے وہ گوہر پیدا کئے جن کی چمک آنکھوں کو خیرہ کئے دیتی ہے تحریر ان کی اتنی اجلی، اتنی پاکیزہ، اتنی صاف شفاف، اتنی رسیلی، اتنی میٹھی، اتنی شیریں کہ خواجہ حسن نظامی کا روزنامچہ اپنا لطف کھو بیٹھے اتنی پُر شکوہ، اتنی جاذب نظر کہ ابوالکلام آزاد کی تحریروں کا سحر ٹوٹتا نظر آئے عمق اور بلندی اس درجہ کہ مناظر احسن گیلانی کی تحریروں کی چاشنی ذائقہ کا حصہ بن جائے تحریر میں وہ کسی کے مقلد نہیں اپنا ہی انداز اپنا ہی اسلوب وہ بھی اتنا جداگانہ اور متنوع کہ چاہنے کے باوجود اس اسلوب تک رسائی ممکن نہ ہو، ہزاروں مقالات ومضامین ان کے گہربار قلم سے نکلے اور تاحال

سلسلہ دراز ہے علم کی گہرائیوں، معلومات کی ہمہ گیریوں کے ساتھ تاریخ اردو ادب پر بھی ان کا مطالعہ قابل رشک ہے، ہماری صف کے لوگوں کے مقابلہ میں اردو ادب کے مختلف ادارو، مختلف عظیم ادبی شخصیات، ان کے ادبی کمالات اوران سب کے مابین بنیادی فرق اور امتیازات کو بھی وہ خوب جانتے اور پہچانتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ کبھی ان کی تحریریں غالب کے خطوط کی یادیں تازہ کرتیں اور کہیں قلعۂ معلیٰ کے اردو نمونے بن کر سامنے آتی ہیں، لکھنا ان کے لئے اتنا ہی سہل جتنا دوسروں کے لئے لیٹنا، سونا اور لذتِ کام ودہن میں مصروف ہونا ہر موضوع پر دادِ قلم دی اور ہر عنوان کو نکھارا اور سنوارا علمی موضوعات سے لے کر حالات حاضرہ پر بھی وہ جچی تلی رائے کا اظہار کرتے اور ان کی رائے میں وزن بھی ہوتا ہے، فکر بھی، سچائی بھی۔

ان کی تصنیفات وتالیفات کی تعداد ایک درجن سے زائد ہے۔

۱۔ تذکرۃ الاعزاز سوانح حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ

۲۔ ایمان کیا ہے؟ ترجمہ تکمیل الایمان مصنفہ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ۔

۳۔ طریقۂ تعلیم ترجمہ تعلیم المتعلم مصنفہ الامام برہان الاسلام (الزرنوجی) تلمیذ صاحب ہدایہ

۴۔ فروغِ سحر مجموعۂ مضامین۔

۵۔ گل افشانی گفتار مجموعۂ تقاریر۔

۶۔ خطباتِ کشمیری مجموعۂ تقاریر۔

۷۔ نقشِ دوام سوانح امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ۔

۸۔ لالۂ وگل شخصیات پر لکھے گئے مضامین کا مجموعہ۔

۹۔ اسمائے حسنیٰ کی برکات۔

۱۰۔ تفسیر ابن کثیر پروقیع اور علمی کام۔

۱۱۔ بیضاوی کے ایک جز کی شرح وترتیب بنام ''تقریر شاہی'' وغیرہ کے علاوہ چند کتابیں زیر تالیف ہیں ان کے زیر ادارت ماہنامہ ''محدث عصر'' ان کی قلمی جولانیوں کا ثبوت ہے، تصنیفات پر ان کی تقریظات اور مقدمات کا شمار سو وہ اب ممکن نہیں۔

تحریر وقلم سے ان کی وابستگی جتنی قریبی، پختہ اور مضبوط، تقریر وخطابت سے بھی اتنی ہی قربت، اتنی ہی نزدیکی، اتنی ہی منفرد اور مہتم بالشان، وہ خطابت کی دنیا کے تنہا ایسے مقرر جن کے لب ولہجہ اور اندازِ گفتار کو اختیاری اور غیر اختیاری طور پر ہزاروں نے اپنایا مگر چند قدم چلنے کے بعد سب نے حوصلہ ہار دیا، وہ اپنے انداز کے خود ہی موجد اور خود ہی خاتم بہت سوں نے انظر شاہ بننے کی کوشش کی مگر بقول استاد ذوق ع

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب

گذشتہ ۳۵ رسال سے میں ان کو سن رہا ہوں ہزاروں کے مجمع میں بھی سنا، مختلف تقریبات اور پروگراموں میں بھی شرکت کی، عظیم الشان اجتماعات میں بھی شریک ہوا، شاہ صاحب ہر صورت میں شاہ صاحب ہی ثابت ہوئے غلّہ اسکیم کے جلسوں میں، دیوبند کے محلوں اور دیگر مواقع پر ان کی تقاریر کی گونج ہے، مجمع صرف ان کو سننے کے لئے جمع ہوتا اور ان کی تقریر کے اختتام پر اپنے گھروں کو لوٹنے لگتا ہے جوش ملیح آبادی کے بارے میں کسی نے لکھا تھا کہ الفاظ ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے۔ (مجھے یہ تعبیر کبھی پسند نہیں آئی) الفاظ شاہ صاحب کے اردگرد پروانوں کی طرح پوری وارفتگی، پورے جذبے کے ساتھ چکر لگاتے ہیں، کب ان کی نظر کرم ہو اور ان کی نوکِ قلم اور نوکِ زبان سے ادا ہونے کی سعادت حاصل ہو، علوم کا گنجینہ، معلومات کا خزینہ ان کے مواعظ اور خطبات کی شان ہی نرالی ہے، ابوالکلام آزاد کی سحر انگیز خطابت، عطاء اللہ شاہ بخاری کی گھن گرج، حفظ الرحمٰن سیوہاروی کا استدلال، حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی مہارت، شبیر احمد عثمانی کی طلاقت لسانی نے اگر کہیں ٹھکانا بنایا تو وہ شاہ صاحب کی ذات ہے، جنوبی افریقہ، کینڈا، پناما، ویسٹ انڈیز، برطانیہ، شارجہ، دبئی، کویت، بنگلہ دیش، پاکستان، سعودی عرب، ماریشس، ریونین وغیرہ ممالک کی زمین ان کے مضبوط قدموں کی دھمک اور اعلیٰ خطبات وتقاریر کی چمک اپنے قلب اور اپنے سینے پر محسوس کرتی ہے، ہندوستان کے ہزاروں اسفار، ۵۲ رسال کے عرصہ میں ہزار ہا ہزار جلسوں اور اجتماعات میں ان کی شعلہ بیانی کے ہمیشہ سے چرچے غرض

دورِ آخر میں شاہ صاحب جیسا دوسرا کوئی مقرر اور خطیب اپنی تقریر اور خطابت کا ایسا سحر قائم کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا اور بات یہیں آکر ٹھہری۔

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر
محوِ حیرت ہے ثریا رفعتِ پرواز پر

اپنے وقت کے باکمال انسانوں، نامور شخصیات، سرکردہ لوگوں، برگزیدہ افراد اور عالمی سطح کی شخصیات سے ان کے تعلقات بھی رہے اور مراسم بھی، حاضری اور ملاقاتیں بھی سب نے ان کو سراہا، سب نے ان کو چاہا اور سب نے ان کو سینے سے لگایا، متعدد بار زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہوچکے ہیں، علمِ حدیث پر خداوند قدوس نے ان کو خصوصی نظر عطا کی اور آج ممتاز محدثین میں شمار کئے جاتے ہیں، عزم اور ارادہ ان کی زندگی کا حسین عنوان ہیں، ایک طوفان بھی ان کی زندگی میں آیا ایسا طوفان کہ جس میں

دیکھا جو تیر کھاکے کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہوگئی

یہ طوفان تھا یا اپنی بقا کی جنگ، یا معرکۂ کرب وبلا ان سب سے زیادہ موزوں یہ کہ خود کو ٹوٹنے، بکھرنے، اپنے اور جماعت کے وجود کو ریزہ ریزہ ہونے سے محفوظ رکھنے کا ایک مسلسل اور مستقل عمل ہمیشہ روشنی کی تلاش رہی اور جب صدق وصفا کے چراغ ہتھیلیوں پہ سجالئے تو یہ عمل

کوئی بزم ہو کوئی انجمن یہ شعار اپنا قدم ہے
جہاں روشنی کی کمی ملی وہیں اک چراغ جلادیا

ان پر لکھنے کے لئے بہت کچھ باقی اور زندگی کے دیگر پہلوؤں پر خامہ فرسائی کے لئے دوسری صحبت بھی درکار ۱۹۲۸ء کو انہوں نے عالم امکان کا پہلا جلوہ دیکھا اور تب سے آج تک علمی عظمتوں اور رفعتوں کے ساتھ مناظرِ قدرت، مناظرِ عالم، مناظرِ فطرت سے ان کا ذہن، ان کا قلب، ان کی روح، ان کی آنکھیں اکتسابِ نور کررہی ہیں۔

❁ ❁ ❁